فنِ خطابت



شورش کاشمیری

فنِ خطابت

شورش کاشمیری

مطبوعات چٹان

۸۸ میکلوڈ روڈ، لاہور

808.5 Shorash Kashmiri
Fun-e-Khitabat/ Shorash Kashmiri.-
Lahore: Al-Faisal Nashran, 2019.
128p.

I. Taqareer - Fun I. Title Card.

ISBN 969-503-392-X

فروری 2019ء

کتاب : فن خطابت
مصنف : شورش کاشمیری
مطبع : میاں سنز پرنٹرز، لاہور
ناشر : مکتبہ چٹان، لاہور
اشاعت : ہفتم
قیمت : -/250 روپے

واحد تقسیم کنندگان:

AI-FAISAL NASHRAN
Ghazni Street, Urdu Bazar, Lahore, Pakistan
Phone: 042-37230777 & 042-37231387
http: www.alfaisalpublishers.com
e.mail: alfaisalpublisher@yahoo.com

فہرست

عرضِ ناشر

زیرِ نظر کتاب کو دراصل بہت پہلے منظر عام پر آجانا چاہیے تھا لیکن
ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا

طباعت کے لوازمات کی نزاکت کے باعث اشاعتی کام کس قدر مشکل ہو چکا ہے اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اس کے ساتھ وابستہ ہیں۔

والدِ مرحوم آغا شورش کاشمیری کے لخت لخت مسودہ کو یکجا کرنا بہت ذمہ داری کا کام تھا اور زیادہ عرصہ اسی میں صرف ہُوا بہر حال مَیں نے ان مشکلوں پر عبور حاصل کر کے اس کتاب کی اشاعت کا حق ادا کرنے کی اپنی سی کاوش کی ہے.....کاوش..... قارئینِ کرام کے سامنے ہے اور اس پر نقد و نظر کا انھیں پُورا پُورا حق ہے بلکہ ان کی تنقید اور دوستانہ مشورے کتابوں کے آئندہ اشاعتی سفر میں میرے لیے چراغِ راہ ہوں گے۔

مخلص

مسعود شورش



شورش سے میرا رشتہ ہے اور وہ ازلی ہے
میں وقت کا رستم ہوں وہ ہے ثانی سہراب

مولانا ظفر علی خانؒ

....

اس نوجوان کی تقریر سنی زبان ہی سے نہیں دل سے دعا نکلتی رہی۔ اس کی طبیعت کا رُخ نہایت خوشگوار ہے۔ اس قدرتی ملکہ کی اس نے علم و مطالعہ کی وسعت سے حفاظت کی تو اردو زبان ایک ایسے مقرر سے محروم نہیں رہے گی جس کی فی زمانہ اس کو ضرورت ہے۔

امام الہند ابو الکلام آزادؒ

....

معلوم ہوتا ہے کہ اس کے حلق میں گراریاں لگی ہوئی ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ آواز میں فنا نہیں ورنہ ہم لوگ چوکڑی بھول جاتے۔ بحمد للہ مطمئن ہوا۔ بڑھاپا جوان ہو گیا ہے۔ میں برگد کا درخت نہیں کہ اس کے نیچے دوسرا پودا اگ نہیں سکتا۔ شورش میری مراد ہے۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ

....

ہماری جماعت میں مولانا حبیب الرحمٰن، مولانا مظہر علی، شیخ حسام الدین اور عزیزم شورش کے اضافے سے چار ایسے آدمی ہیں جو پانی کے بہاؤ میں

شیر کی طرح سیدھے تیر سکتے ہیں۔

چودھری افضل حقؒ

....

جیتے رہو اب ہمارا نہیں تمہارا زمانہ ہے۔ ہم بوڑھے ہو چکے ہیں۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ ماشاءاللہ خوب تقریر کی ہے۔

(شہید گنج کی کانفرنس کی صدارت کے بعد فرمایا)

مولانا شوکت علیؒ

....

جہاں تک زبان اور ادب کا تعلق ہے میں پہلے ہی اس بات کا قائل تھا کہ آپ کو اللہ نے کلام پر بڑی قدرت عطا کی ہے..... آپ صحیح معنوں میں مولانا ظفر علی خان مرحوم کے جانشین ہیں۔

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

....

پنجاب نے اقبالؒ و ظفر علی خانؒ ہی کو نہیں بلکہ شورشؒ کو بھی پیدا کیا ہے۔

ڈاکٹر پروفیسر رشید احمد صدیقی

علی گڑھ یونی ورسٹی

دیباچہ

شورش مرحوم کی کتاب فنِ خطابت میرے زیرِ نظر ہے اور اس پر دیباچہ نگاری کا خوشگوار فریضہ میرے سپرد ہُوا ہے۔ اس انتخاب پر مَیں اتنا خوش ہُوا ہوں کہ بیان سے باہر ہے۔ میرے دل میں شورش کی محبت جو ان کی عظیم قربانیوں کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی، ہمیشہ موجزن رہی۔ اگرچہ مَیں ان سے عمر بھر ڈرتا بھی رہا۔ وہ ایک سیلِ تندرو تھے غصّہ آجائے تو راستے کی چٹانوں اور کناروں کے مرغزاروں کو یکساں طور سے بہا کر لے جاتے تھے..... لیکن میری محبت ان سے کبھی کم نہیں ہوئی۔ اس لیے کہ ان کا غصّہ بھی یک روز دو روز سے آگے نہیں بڑھا۔

زیرِ نظر کتاب فنِ خطابت کو پڑھ کر مَیں حیران ہُوا اور خوش بھی بہت ہُوا۔ حیرت اس وجہ سے ہوئی کہ مَیں سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ شورش کا طوفانی قلم کبھی اتنا سکون آشنا بھی ہو سکتا ہے۔ فنِ خطابت ایک خالص علمی اور تجرباتی موضوع ہے اس کی توضیح کے لیے، غور و فکر اور تامّل و تفکّر کی ضرورت ناگزیر ہے۔ کیونکہ اس کی بنیاد ایک نظامِ استدلال پر ہوتی ہے اور استدلال ہمیشہ قضایا و مقدمات میں جکڑا ہُوا آگے بڑھتا ہے۔ اسے آپ اس گھوڑے کے مشابہ خیال کریں جس کے لیے لگام ضروری ہوتی ہے۔

علمی موضوع پر لکھتے وقت اشہبِ قلم سرپٹ اور بے لگام نہیں دوڑتا رک رک کر اور سوچ سمجھ کر چلتا ہے بلکہ ہوش و تدبیر سے چلایا جاتا ہے۔

شورش کی کتاب فنِ خطابت کو مَیں نے اس لیے نادر قرار دیا ہے کہ اس میں مجھے

ایک دوسرا شورش نظر آیا ہے جو شورش پسند ہونے کے باوجود ضابطہ شناس اور نظام پسند بھی ہے۔

مَیں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ فنِ خطابت پر اُردو میں اس سے پہلے کوئی نہیں لکھی گئی۔ (خود شورش نے بھی یہ دعویٰ نہیں کیا) لیکن یہ دعویٰ بڑے تحکم کے ساتھ کیا جاسکتا ہے کہ اس خصوصیت کی کوئی کتاب اس موضوع پر اس سے قبل شاید نہیں لکھی گئی۔ (شاید اس لیے کہہ رہا ہوں کہ کم از کم مجھے معلوم نہیں لیکن مَیں سوچتا ہوں کہ اگر ہوتی تو میرے علم میں کسی عنوان آجاتی۔)

مَیں نے اُردو میں اس موضوع پر جو کتابیں دیکھی ہیں ان میں ایک نظیر حسین سخا دہلوی نے 1911ء میں لکھی تھی۔ مبادیات کے اعتبار سے سخا کی کتاب بُری نہیں۔ اس نے انگریزی کتابوں سے مواد حاصل کیا ہے لیکن اُردو خطابت کی جو مثالیں پیش کی ہیں غیر موثر ہیں۔

دوسری کتاب موسوم بہ فنِ خطابت سیّد کلب مصطفیٰ نے 1952ء کے بعد اور 1958ء سے پہلے لکھی۔ افسوس ہے کہ اتنی ضخیم کتاب پیش کرنے کے باوجود طباعت کی تاریخ درج نہیں کی۔ کتاب اچھی ہے لیکن بالعموم انگریزی کتابوں سے مستعار لیا گیا ہے تاہم اسے قابلِ قدر کہا جاسکتا ہے چند کتابیں اور بھی مل جاتی ہیں۔ لیکن ان کی حیثیت فقط یہ ہے کہ کسی فہرست (کتابیات) میں شامل کرلی جائیں تو اس موضوع کے تحقیق کنندہ کو ان میں کچھ اچھی باتیں مل سکتی ہیں۔

لیکن شورش کی موجودہ کتاب محض فہرست کی رونق کی حد تک اہمیت نہیں رکھتی۔ اس کے چند دیگر خصائص ہیں جو اسے فی الحقیقت ایک وقیع اور مستقل کتاب بنا رہے ہیں انہیں کی بنا پر مَیں اس سے پہلے لکھ آیا ہوں اور اب پھر کہتا ہوں کہ یہ منفرد تصنیف ہے اور کوئی دوسری کتاب اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔

میری اس رائے کو احباب مبالغہ خیال نہ کریں یہ امر واقعہ ہے کہ شورش کی

کتاب کا یہی ایک وصف انفرادیت کے اثبات کے لیے کافی ہوتا کہ یہ ایک شعلہ بیان خطیب کی تجرباتی کتاب ہے لیکن میرے پاس کتاب کی وقعت کے ثبوت کے لیے اس کے علاوہ بھی وزنی دلیلیں موجود ہیں۔

فن خطابت کے اصولوں کی توضیح کے لحاظ سے شورش نے انگریزی کتابوں سے کچھ استفادہ تو کیا ہوگا۔ لیکن اس نے جتنے اصول بیان کیے ہیں وہ ان کے اپنے ذاتی تجربے اور عمل سے پیدا ہوئے ہیں، ایک عام فن شناس علمی مطالعہ و تحقیق کی بنا پر ایک اچھی کتاب لکھ سکتا ہے لیکن ایک شعلہ بیان مقرر، خطیب اور واعظ جب ان موضوعات پر قلم اٹھائے گا تو اس کی توضیح یا اصول بندی نظری، کتابی اور مطالعاتی نہ ہوگی، اس میں اس کی شخصیت کا عمل اور اس کا ذاتی مشاہدہ اور وہ ردِ عمل بھی شامل ہوگا جسے وہ بچشمِ خو د مشاہدہ کر رہا ہوتا ہے یا کر چکا ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ شورش کی یہ کتاب نظری / نظریاتی کم ہے اور تجرباتی، مشاہداتی اور تاثراتی زیادہ ہے۔ اس میں مختلف تاثیرات کی مثالیں اور نمونے نہ صرف یہ کہ اپنے ملک کے اجتماعات و شخصیات سے متعلق ہیں بلکہ ان میں سے اکثر وہ ہیں جن کا تعلق شورش کی اپنی سماعت و مشاہدہ سے ہے..... وہ ایک اچھا سامع بھی تھا۔ اس نے ایک شعلہ بیان مقرر ہونے کے باوجود اپنے قلب و ذہن کو ابو الکلام آزادؒ، مولانا محمد علی جوہرؒ، مولانا ظفر علی خانؒ اور سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے سحر تقریر سے مغلوب پایا چنانچہ اس کا بار بار ذکر اس کتاب میں آیا ہے۔ اس میں یہ وضاحتیں بھی آئی ہیں کہ مذکورہ شعلہ بیان مقررین کس طرح ہنسنے والے کو رُلا دیتے اور رونے والوں کو ہنسا دیتے تھے۔ شورش نے یہ تشریح بھی کی کہ مذکورہ بالا مقررین کی ان تقریروں کی تاثیر میں کون کون سے جذباتی، شخصیاتی اور فکری عناصر کار فرما تھے۔ قدرتی امر ہے کہ شورش کی یہ اصول شناسی ذاتی مشاہدے پر مبنی ہے اور اسی وجہ سے زیادہ محکم اور قطعی بھی ہے۔

میں اعتراف کرتا ہوں کہ شورش کی اس کتاب نے میرے دل میں بڑی جگہ

بنائی ہے اور بڑی عزت حاصل کی ہے۔ میں اس کا بے حد مداح ہوں کیونکہ اس کا طریق توضیح مدرسانہ ہے۔ سب کو معلوم ہے کہ میں ایک مدرس ہوں اور آج تک میں نے جتنی کتابیں لکھی ہیں مدرسانہ انداز میں لکھی ہیں۔ اس انداز کی خاص بات یہ ہے کہ اس کا مقصود مطالب کا براہ راست اور واضح ابلاغ ہوتا ہے اس لیے علمی دبدبہ اور رعب کی نمائش کے بجائے مطالب کا افہام آسان اور تشریحی ہوتا ہے تاکہ قاری کی سمجھ میں سب کچھ آجائے۔ شورش کی یہ پہلی کتاب ہے جس میں طنطنہ نہیں وضاحت وصراحت کا مقصد غالب ہے۔

ایک اور بات جس نے مجھے گرویدہ بنایا ہے وہ یہ ہے کہ شورش نے اس کتاب میں برِصغیر کی تحریکوں کا تجزیہ اُردو زبان کے عظیم خطیبوں کے حوالے سے کیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ

"اُردو نے انگریزی عہد میں ایک تاریخ پیدا کی۔ اس سے قطع نظر کہ مسلمانوں نے اُردو کی معرفت اپنی بڑی بڑی شخصیتوں کو جنم دیا اور سرسیّد سے اقبال تک اُردو ہی ذریعۂ خطاب رہی۔ اُردو ہی کے بل پر مسلمانوں نے اپنا ملّی تشخص قائم کیا لیکن متحدہ جدوجہد کی مشترکہ چھاپ کو بھی اُردو نے مجلّی کیا۔ یہ تو رہا اُردو کا کردار ملک کی سیاسی و تہذیبی زندگی کی ترقّی میں..... لیکن شورش کا یہ جملہ ہر اُردو تحریک کا ولولہ انگیز نعرہ بننے کا مستحق ہے کہ

"اُردو میں کائنات کے سما جانے کا حوصلہ ہے"۔

اللہ اللہ کیا بلاغت ہے، یہ ایجاز اور یہ اعجاز شورش ہی کے قلم سے ظہور پا سکتا تھا۔ مذکورہ بالا چند لفظوں میں کائنات سمٹ کر آگئی ہے۔ اُردو کی وسعت پذیری، اس کی مہمان نوازی، اس کی حوصلہ مندی، اس کی کشادہ دلی، اس کی ہمہ نوازشائستگی کے بارے میں اس سے بہتر الفاظ آج تک کسی نے نہ لکھے ہوں گے۔ شورش کا مذکورہ بالا

ایک فقرہ اُردو کی بلاغت کا موزوں ترین موٹو ہے۔

شورش کی یہ کتاب اگرچہ فنِ خطابت کے بارے میں ہے لیکن ایک لحاظ سے یہ اُردو زبان کے اسالیب بیان کے متعلق مجموعۂ اشارات بھی ہے۔ اس میں ملک کے اُردو ادیبوں، انشاپردازوں، خطیبوں اور شاعروں کے خصائصِ زبان و بیان اور ان کی بلاغتوں کے لہجوں اور تیوروں کے بارے میں نہایت عمدہ نکتے ملتے ہیں۔

اور آخر میں یہ فوقیت بھی ہر لحاظ سے قابلِ ذکر ہے کہ یہ کتاب شورش کے اسلوبِ تحریر کا ایک ایسا نمونہ ہے جو اس کی صحافتی تحریروں سے بالکل الگ نکھار اور معیار کا حامل ہے۔ اس میں جوش کی جگہ سکون، خطیبانہ اثر انگیزی کی جگہ، دل نشین متانت اور خروش و طنطنہ کی جگہ علمی وجاہت اور وقار پایا جاتا ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ جب بھی کوئی شخص شورش کے ادبی رتبے پر کوئی کتاب لکھے گا، وہ اس کتاب کے ادبی اسلوب کا تذکرہ ضرور کرے گا۔ اور کہے گا، کاش شورش اس طرح کی دو چار کتابیں اور بھی لکھ جاتا۔

ڈاکٹر سید عبد اللہ
پروفیسر ایمریطس

السامن:۔
اُردو نگر۔ملتان روڈ، لاہور

خطابت کا چارٹ

مطالعہ سے پہلے..... مطالعہ کے بعد

خطابت کے اجزائے ترکیبی کا تناسب درج ذیل ہے۔ اپنی ابتدائی استعداد کا تناسب لکھیں، مطالعہ کر چکیں تو اپنے تجربہ کا جائزہ لیں اس طرح چھ ماہ کے لیے چارٹ بنالیں۔ ہر مہینہ کی پریکٹس کا نتیجہ لکھتے رہیں۔ پہلی ششماہی میں معلوم ہو جائے گا کہ آپ کے شوق و محنت نے کس قدر برگ و بار پیدا کیے ہیں۔

نمبر شمار	اجزائے خطابت	تناسب	مطالعہ سے پہلے	مطالعہ کے بعد	تجربہ سے پہلے	تجربہ کے بعد	
1	آواز	10فی صد					
2	اظہار	10فی صد					
3	تکنیک	10فی صد					
4	اسلوب	15فی صد					
5	سلاست	15فی صد					
6	متانت	10فی صد					
7	ظرافت	10فی صد					
8	اشارات	5فی صد					
9	استدلال	5فی صد					
10	تجربہ	10فی صد					
11	تمثیلات	5فی صد					
12	انفرادیت	5فی صد					

خطابت

عوام سے اجتماعاً ہم کلام ہونے کا نام خطابت ہے۔ اصطلاحاً اس فن کا نام ہے جس کا مقصود و مطمحِ عوام سے خطاب کرنا اور ان کے دل و دماغ میں اپنی غایت و منشا اتارنا ہے۔ خطابت میں ترغیب و ترہیب دونوں ہیں۔ فی الجملہ خطابت زبان کا اعجاز ہے۔ خطابت کے تین عناصر ہیں۔

1) خود مقرر یا خطیب جو اپنے فن اور شخصیت کی معرفت عوام سے خطاب کرتا ہے۔

2) اس کا پیام یا موضوع جس کا اظہار انفرادی اور مقصود اجتماعی ہوتا ہے۔

3) سامعین و حاضرین (پبلک) جن سے خطاب کیا جاتا ہے۔

خطابت کب شروع ہوئی؟ مختصراً جب انسان نے بولنا شروع کیا۔ وہ شخص سب سے پہلا خطیب تھا جس نے سب سے پہلے ساتھیوں سے خطاب کیا یا انسانوں کا ایک مجمع جو اس کے گرد و پیش تھا، اس سے کلام کیا۔ انسان اور خطابت ہم عمر ہیں۔ دونوں کا ارتقائی سفر یکساں ہے۔ اس باب میں اختلافِ رائے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ابلاغِ عامہ کا آغاز تقریر سے ہُوا اور تحریر سے کہیں زیادہ تقریر کی عمر ہے۔ دونوں میں صدیوں کا فاصلہ ہے۔ پہلے خطیب خُدا کے پیغمبر تھے جنہیں اللہ تعالیٰ نے انسانی فلاح کے لیے مبعوث کیا۔ تمام خُدائی کتابیں جو پیغمبروں پر نازل ہوئیں ان کا سراپا خطیبانہ ہے۔ اُن کے لب و لہجہ میں ایک خطیب کی گونج اور گرج ہے۔ گو بعض صحائف امتدادِ زمانہ سے محرف ہو گئے لیکن خطابت کی عمیق رُوح ان تمام کتب میں رچی بسی محسوس ہوتی ہے.......

اسلام نے جن مذاہب اور اُن کے صحائف کا تذکرہ کیا ہے، اُن سے قطع نظر، دوسرے مذاہب جنہیں صدیوں کے تھپیڑوں نے مسخ کر دیا اور پھر جن کی تعلیمات کو پتھروں اور دھاتوں سے اتار کر ان مذاہب کے دانشوروں نے مرتب کیا اُن میں شروع سے آخر تک خطابت کا آہنگ ہے۔ ہر زبان کی نثر کا آغاز سماوی کُتب سے ہوا پھر ان کے بعد السنۂ شرقیہ کا ابتدائی ادب مذہبی رہا۔ اس کا لہجہ خطیبانہ ہے۔ اب انسان نے قرطاس و قلم میں انفرادیت پیدا کر لی ہے جس سے زبان و بیان، اسلوب کی رنگارنگ شاخوں میں تقسیم ہو چکے ہیں۔ تقریر کا مزاج تحریر سے مختلف ہے اور تحریر کے رنگ ڈھنگ تقریر سے جدا ہیں۔ پہلے خطابت میں یکسانی اور تنوع تھا۔ اب بوقلمونی اور اختلاف ہے۔ فن ایک ہی ہے لیکن شاخیں متعدد ہو گئی ہیں۔ یہی معاملہ ادب کا ہے کہ نثر کئی خانوں میں تقسیم ہو چکی ہے اور شعر کئی اصناف میں بٹ چکا ہے۔

خطابت کے فن پر اب تو کتابوں کا ایک ڈھیر لگ چکا ہے۔ گو السنۂ شرقیہ میں اس موضوع پر کتابیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ عربی کے متعلق مَیں نہیں کہہ سکتا کہ فی زمانہ کوئی کتاب آئی ہے یا نہیں؟ لیکن اردو زبان میں اس موضوع پر کسی خطیب یا ادیب نے قلم نہیں اٹھایا۔ ایک دو کتابچے نظر سے گزرے، جو معیاری نہ تھے۔ کسی انگریزی مقالے یا عربی مضمون کا چربہ تھا۔ کوئی اٹھارہ سال پہلے لکھنؤ سے فنِ خطابت پر ایک کتاب شائع ہوئی لیکن فاضل مصنف نے انگریزی کتابوں کے مطالعاتی علم پر انحصار کیا۔ اگر انہیں تجرباتی علم ہوتا تو اپنی کتاب کے نوّے فی صد پر خطِ تنسیخ کھینچ دیتے البتہ ذاکری کے موضوع پر انہوں نے چند صفحوں میں روشنی ڈالی ہے۔ لیکن وہ تمام کتاب کا اعشاریہ ایک فیصد بھی نہیں اور اس سے خطابت کے خط و خال واضح نہیں ہوتے۔ فاضل مؤلف نے اُردو کا نسخہ انگریزی کے معمل میں تیار کیا ہے۔

اُردو خطابت میں کئی رعایتوں سے عربی خطابت ہی کا آب و رنگ ہے۔ انگریز ہندوستان میں وارد ہوئے اور ان کی سلطنت بیسویں صدی کی دوسری دہائی کے

استحکام میں داخل ہو گئی تو اس دوران میں کئی قسم کے اجتماعات کی نیو رکھی گئی۔ بعض قومی، تعلیمی، ادبی، معاشری اور سیاسی تحریکیں پیدا ہوئیں۔ انہی کا نتیجہ تھا کہ برطانوی علم و تعلیم کے زیرِ اثر خطابت کا ایک نیا مزاج اور ایک اسلوب پیدا ہو گیا۔ آج ہم علم و سیاست کی جن وادیوں میں گامزن ہیں وہ اکثر و بیشتر برطانوی عہد کی یادگار ہیں۔ اور ان پر واضح طور پر مغرب چھاپ لگی ہوئی ہے۔ المختصر ہمارے قومی اجتماعات اور سیاسی تقریبات یورپی ضمیر و خمیر کی پیداوار ہیں۔ ان کا نصف مغربی حکما کی روایتوں سے تیار ہُوا ہے اور وہ چیز جس کا عُرفِ رائے عامہ ہے اپنی اساس کے اعتبار سے مغربی ہے۔ لیکن سیاست کا خلقی اعتبار سے مغربی ہونا، اُردو خطابت کے محرکات پر اثر انداز ہُوا ہے۔ اس اخذ و تاثّر کے باوجود، اُردو خطابت اپنے مضمرات سے عربی خطابت ہی کی رنگینی و سنگینی رکھتی ہے۔ اس کی تب و تاب، جوش و حرارت، رعنائی و زیبائی اور اعجاز و ایجاز میں عربی ہی کا پر تو ہے۔ مشرق کی بیداری کے باوجود بعض تاریخی روایتوں سے متعلق ابھی مغرب ہی کا بول بالا ہے۔ اس رعایت سے خطابت کی کلاہ اہلِ یونان کے سر باندھی جاتی ہے۔ ارسطو نے سب سے پہلے خطابت کے اصول منضبط کیے اور اس نام کا ایک رسالہ لکھا۔ علامہ ابنِ رُشد نے اس پر تلخیص لکھی۔ پھر کئی ایک حکمائے اسلام مثلاً فارابی اور ابنِ سینا وغیرہ ہم نے اس سے مضامین اخذ کیے۔ اہلِ یونان کے بعد اہلِ روم کا ذکر آتا ہے۔ ان کے بعد عربوں کی خطابت ہے۔ یہ تحقیق کا علمی مسئلہ ہے۔ اس کتاب سے اس کا تعلق نہیں۔ اب سائنس کے ظہور و عروج اور لغت کی ترقّی و احیا کے ساتھ خطابت مختلف قوموں میں تقسیم ہو چکی ہے۔ پہلی ڈیڑھ صدی میں انگریزی اور فرانسیسی کو معراج حاصل ہوئی تو فرانس، انگلستان اور امریکا کے خطبا کی عالمی شہرت ہوئی اور وہ تمام قومیں جو ان کی سیاسی، علمی بالادستی سے مرعوب تھیں، ان کے تذکرہ و تتبع کی ہو گئیں۔ بہر کیف اُردو زُبان کی فرمانروائی کے زمانہ میں اتنے بڑے خطیب پیدا کیے کہ ان کی خصوصیت حاصل ہوتی یا کوئی مؤرخ برِ عظیم میں اُردو خطابت کے وسیع

اثرات کا جائزہ لیتا تو اُردو زبان کی پذیرائی اور سحر کاری و پُرکاری کے متعلق ان حقیقتوں کو نظر انداز نہ کر سکتا کہ برِ عظیم کی سیاسی آزادی اُردو زبان کی فتح مندیوں میں سے ایک ہے۔ ہم نے برِ عظیم کی جدوجہدِ آزادی کا عوامی الاؤ اس سے روشن کیا۔ اور یہی زبان قومی جدوجہد کے مختلف دوائر میں ہمارے ولولوں کو انگیزتی رہی۔ اُردو ہندوستان میں تیار ہوئی، فارسی نے اس کی رگوں کو خون دیا اور عربی نے جوان کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے مزاج میں خطابت کا بانکپن رہا اور یہی جادو اس کے الفاظ کی رُوح ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ عربوں کے ہاں تحریر کا فن بہت دیر بعد آیا لیکن ان میں تقریر کا ملکہ شروع سے تھا۔ انہیں اپنی زبان، اپنے حافظہ، اپنی خطابت اور اپنی شاعری پر اس قدر ناز تھا کہ اپنے سوا تمام دنیا کو عجم (گونگا) سمجھتے۔ وہ اپنے بچوں کو شروع ہی میں خطابت کی تعلیم دیتے اور یہ ان کی تربیت کا جزوِ لازم تھا۔ وہ نوشت و خواند سے آگاہ نہ تھے۔ لیکن خطابت کی تعلیم و تربیت میں لوازم و اشکال کو ملحوظ رکھتے۔ مثلاً اسلوبِ بیان دلکش ہو۔ سحر بیانی قائم رہے۔ الفاظ بوجھل نہ ہوں۔ سلیس اور خوبصورت ہوں۔ صاف لہجہ ہو۔ کھلی باتیں ہوں۔ ہموزن مسجع جملے اور سریع الفہم ضرب الامثال استعمال کی جائیں۔ ہر خطبہ ایجاز و اختصار سے جامع و مانع ہو۔ ہر قبیلہ کوشاں ہو تاکہ ان میں خطیب و شاعر ضرور پیدا ہو اور اس زمانہ میں اسلام کا ظہور نہیں ہوا تھا۔ یہی دو وصف عربوں کے لیے افتخار و عزت کا سرمایہ تھے اور انہی کے بل پر وہ تمام دنیا کو گونگا خیال کرتے اور کسی دوسری زبان کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ ان کا حافظہ گنجِ شایگاں تھا۔ وہ تحریر کے انسان نہ تھے۔ ان کے دورِ جاہلیت کی شاعری کا بڑا حصّہ آج تک محفوظ ہے تو قرطاس و قلم اور طباعت و کتابت سے پہلے اس کا واحد سبب حافظہ تھا۔ ظاہر ہے کہ شاعری کے لیے حافظہ کے دروازے ہمیشہ کُھلے رہتے ہیں۔ لیکن دورِ جاہلیت سے پہلے کے خطبا کی روایات اور ان سے منسوب کلمات کا ایک حصّہ تو محفوظ ہو گیا کہ معاشرۂ اسلام نے قرطاس و قلم کا سفر شروع کیا تو حفّاظ کا ایک بڑا حلقہ بقیدِ حیات تھا۔ اور حافظہ کی عفت

مجروح نہیں ہوئی تھی۔ لیکن وہ خطبات جن سے عرب خطابت ممیز و متجلی ہوئی اور جن کی بدولت عرب خطبا کی شعلہ نوائیوں کا چرچا ہے۔ اُن خطبات کا ننانوے فی صد استبداد زمانہ کے باعث تلف ہو گیا۔ اسلام نے بطور مذہب حضور ﷺ کے خطبات کو محفوظ رکھا یا پھر ان کے جانشینوں (صحابہ کرام رضی اللہ عنہم) کے بعض افسردہ و عصارہ کی حد تک محفوظ رہ گئی۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے خطبات ورقعات کا مجموعہ نہج البلاغہ بھی، حافظہ کی معرفت سال بعد مرتب ہُوا۔ لیکن اس مجموعہ کو خطبات کے شہ پاروں کی حیثیت سے مرتب نہیں کیا گیا بلکہ ایک دعوت اور ایک تحریک کے طور پر جمع کیا گیا۔ اِس کے پس منظر میں اُموی استبداد کا ردِّ عمل تھا۔ ان مقدس ہستیوں کے بعد، اگرچہ چند علما و فضلا کی تقاریر ملتی ہیں۔ یا بعض خطبا کے افکار و سوانح کا پتہ چلتا ہے تو وہ قرطاس و قلم کی معرفت ادبی تحفظ ہے۔ بہر حال عربی خطابت کے بارے میں یہ چیز متفق علیہ ہے کہ مبداء فیاض نے عربوں کو الفاظ کی جادوگری کا فن عطا کیا۔ انہوں نے معراج کو پہنچایا۔ ان کے سیاسی انحطاط کے ساتھ اُن کا تہذیبی چاند گہنا گیا تو ان کی خطابت کو بھی لونی لگ گئی۔ لیکن عربوں کے اس بُحرانی دور میں بھی ان کی کوئی کل سیدھی نہ تھی، دوسری زبانوں کے مقابلہ میں عربی زبان حُسن و تاثیر کے اعتبار سے نوادرات کا مجموعہ ہے۔ اس کی ساخت خطیبانہ ہے اور اس میں ہر سامع کے لیے کھچاؤ ہے۔ جو لوگ عربی نہیں جانتے وہ بھی اس کی آواز پر گوش بر آواز ہو جاتے اور مطالب محسوس کرتے ہیں۔ عربی فی الواقعہ وجدان کی زبان ہے۔ ان کے الفاظ کا خروش، مسلمانوں کے لیے معنوی آہنگ رکھتا ہے لیکن اس کی خطیبانہ گھلاوٹ، ہر سامع کو متاثر کرتی ہے اور انسان محسوس کرتا ہے کہ ایک پکار اُس سے متعاقب ہے۔

عربی ہی سے اُردو کی چھب ہے۔ اس کا سنگار فارسی سے ہے اور ہندوستانی اس کے ماتھے کا سیندور ہے۔ اب انگریزی نے اس کو دو آتشہ کیا ہے۔ ان عناصر اربعہ نے اُردو خطابت میں جوانی چنانکہ اقتدوانی کا مزاج پیدا کیا ہے۔ اس مبحث کی بعض دوسری

گرہیں کھولنے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ عربی قرآن کی زبان ہے اور قرآن سے مسلمانوں کی شیفتگی اعتقادی ہے۔ اس رعایت سے اختلاف السنہ کے باوجود، قرآن ہی کی زبان، ان کے ایمان کی زبان ہے۔ عرب فتح مندیاں جہاں تہاں وارد ہوئیں، قرآن کی زبان ساتھ گئی۔ پھر ایک خاص موڑ پر عربی کا پھیلاؤ رک گیا لیکن عربی مزاج، مسلمانوں کی دعوت و تذکیر کے ساتھ پھیلتا رہا۔ عربوں نے ایران فتح کیا تو آغوشِ اسلام میں آنے کے بعد اس کی زبان ہی پلٹ گئی۔ ان کی رُوح کا سانچہ ہی دوسرا ہو گیا۔ اور اسی رُوح سے اس کے بدن کو اس طرح توانا و تندرست کیا کہ وسطِ ایشیا کے ممالک میں فارسی اسلام کی دوسری بڑی زبان ہو گئی۔ اس کی وساطت ہی سے ہندوستان میں اُردو کی نیو رکھی گئی اور عربی کی حرارت، فارسی کی صباحت، ہندی کی لطافت اور انگریزی کی شہادت لے کر شتہ ورفتہ ہو گئی تا آنکہ صوبائی زبانوں کے بعض محاورے بھی اس میں رچ بس گئے۔ جس سے یہ چیز صاف ہو گئی کہ اُردو میں کائنات کے سما جانے کا حوصلہ ہے۔ اِدھر ہندوستان اور پاکستان کئی صوبوں کا مجموعہ تھے اور ہر صوبہ میں زبان کے اعتبار سے لسانی فاصلے تھے۔ ان میں زبان کا بُعد نہایت قوی تھا۔ مگر آزادی سے پہلے اُردو کو بین الصوبائی زبان کا مقام حاصل رہا اور سیاسی جدوجہد کے اسی فیصد شعلے اُردو ہی سے روشن ہوئے۔ اُردو نے ہر سیاسی پلیٹ فارم کو بالا کیا۔ اِدھر آل انڈیا مسلم لیگ نے اُردو کو اپنے نصب العین میں شامل کر رکھا تھا اور اس کی لیڈر شپ کا اجتماعی مزاج اُردو تھا۔ اُدھر انڈین نیشنل کانگرس کا حصولِ آزادی کے مرحلہ میں، آخری صدر، اُردو ہی کا سب سے بڑا خطیب اور سب سے بڑا ادیب تھا۔ پنڈت جواہر لعل نہرو اور بابو راجندر پرشاد اُردو کے خطیب تھے۔ آزادیِ ہندوستان اور قیامِ پاکستان کی دونوں تحریکیں عوامی میدان میں اُردو ہی نے جیتیں۔ ان کا بین الصوبائی رابطہ اُردو ہی سے تھا۔ لیکن سوال صرف اُردو کے سحر کا نہیں۔ موضوع خطابت ہے۔ کہ خطابت آنِ واحد میں قرنوں کا سفر کرتی اور کہیں سے کہیں لے جاتی ہے۔ ایکا ایکی پلٹا دے کر ماضی میں پہنچا دیتی،

ناگہاں فرانے بھرتی ہوئی مستقبل کی طرف بڑھ جاتی ہے۔ اس کے لیے گردشِ زمانہ نہیں وہ لیل و نہار کے طلوع و غروب سے آزاد ہے۔ وہ انسانی مجمعوں کو اکائی میں ڈھالتی اور آواز کی لہروں کے ساتھ ماضی، حال اور مستقبل میں گھماتی پھراتی ہے۔ خطابت کی سب سے بڑی خوبی تصور کی پرواز ہے۔ ہم خیالوں کے سیناؤں پر چڑھ جاتے اور جذبات کے سمندروں کی تہہ تک اتر جاتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر خیالات کی پرواز کا نام خطابت ہے کہ ایک انسان کی آواز ان گنت انسانوں کا مافی الضمیر بن جاتی ہے۔ خطابت لسانی اعجاز کا ضمیر ہے۔ اس کے ہیولیٰ میں شاعری، مصوّری، موسیقی اور سنگتراشی کے جوہر ہیں۔ اس کی رُوح ایٹمی توانائی سے کہیں بڑھ کر طاقتور ہے۔ لارڈ سالسبری نے غلط نہیں کہا تھا کہ دنیا آج بھی ان کے ساتھ ہے جو بول سکتے ہیں۔ ڈیما ستھنز یونان کا سب سے بڑا خطیب تھا۔ وہ 322ق-م پیدا ہوا اور 284ق-م وفات پاگیا۔ سسرو روم کا خطیب اعظم تھا۔ وہ 156ق-م پیدا ہوا اور 39ق-م رحلت کر گیا۔ ان ہر دو عظیم خطیبوں نے عیسوی اور ہجری کیلنڈر سے کہیں پہلے جو اصولِ خطابت مدوّن کیے اور جن ضوابط کو فنِ خطابت کا لازمہ قرار دیا، وہی اب تک خطابت کی بنیاد ہیں۔ ان میں قطع و برید کا سوال نہیں۔ البتہ علم و نظر کی راہیں ضرور بدلتی رہی ہیں اور بدلتی رہیں گی کہ زمانہ اُلٹ پھیر کا نام ہے۔ جب تک یہ دنیا قائم ہے..... ؎

ثبات ایک تغیّر کو ہے زمانے میں

اس کائنات کی ضرورتوں اور انسانی مسئلوں میں یکسانی نہیں، ان میں لحظہ بہ لحظہ تبدیلیاں ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اور علم و نظر اس مسافت میں ساتھ ہوتے ہیں۔ مثلاً وحات کے زمانے اور آج کے زمانے میں بُعد المشرقین ہے۔ انسان کہاں تھا اور کہاں پہنچ گیا ہے انسان کا ابتدائی دور، اس کی بوقلمونیاں، اس کے تغیرات، قبائلی زندگی سے مسافتی زندگی کا ظہور، اس عہد کا تنوع اور اس کی رنگارنگی، پادشاہتوں کا نظام، انسان پر انسان کی حکمرانی کے مختلف سانچے علم و نظر کے ارتقا کی تدریجی افتاد، فرمانروائی کے

تصادمات، ایک نظام سے دوسرے نظام کی پیدائش، صنعتی انقلاب کا نشوو ارتقا، سرمایہ داری کی پیچ در پیچ مشکلیں، ریاست کے تصوراتی نظریے، فرد و جماعت کے تحت حقوق و فرائض کا تعین، شخصی حکمرانیوں کا ابطال، جمہور کی فرمانروائیوں کا اجلال، قومیتوں اور وطنیتوں کے نظریے، عالمی انسان کے تصور کا پھیلاؤ، عالمی معاشرے کی تحریکیں، علم کے نئے افق، مسائل حیات کے مرغزار، بہار و خزاں کا طلوع و غروب، غور و فکر کا جدید و قدیم سفر، تعلیم کے جادے، ادب کی محرابیں، سیاست کا بحر ناپید اکنار، اس کی لاتعداد موجیں اور ان کا مد و جزر عصری رجحانات، فکری سلسلے، تہذیبی جہد، معاشی اضطراب و انقلاب، انفرادی وجود کی اجتماعی لہریں اور جدید و قدیم کی آویزش کے منفی و مثبت نتائج، آخر یہ کیا ہیں؟ مسائل و مباحث کا ایک غیر مختتم انبار ہے۔ ہم ایک ایسے زمانہ سے گزر رہے ہیں کہ وقت نے سائنس کے بل پر کرۂ ارضی کی طنابیں کھینچ کر ایک عالمی معاشرہ پیدا کر دیا ہے۔ آج کا انسان قومیت و وطنیت کے عصبیتی خانوں میں تقسیم ہو کر بھی احساس و تصور کے اعتبار سے ذہنی وحدت کا شہری ہے۔ کوئی سانحہ انسان کی دسترس سے باہر نہیں رہا۔ اُدھر قومی و وطنی سیاست مختلف نظام ہائے فکر کی بدولت اتنی ہمہ گیر ہو چکی ہے کہ ایک خطیب و مقرر کے لیے ہر روز نیا موضوع اور ہر آن نیا مضمون پیدا ہوتا ہے ہر صبح کے اخبار اتنے مسائل لاتے ہیں کہ غور و فکر کے دائرے نقد و نظر کے سلسلے اور اظہار و بیان کے معرکے پھیلتے ہی چلے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خطابت کئی خانوں میں بٹ چکی اور فنی لحاظ سے وسیع ہو گئی ہے۔ انسانیت اور خطابت دونوں سفر کر رہی ہیں اور دونوں ہوا کے دوش پر اُڑ رہی ہیں۔ ایک زمانہ تھا ہم اونٹوں اور رتھوں پر سیر کرتے تھے۔ شاہی سواری کے لیے رتھ تھے۔ عام انسانوں کے لیے بیل گاڑیاں اور گدھا گاڑیاں تھیں۔ اب زمانہ ان سب کو چھوڑ چکا ہے قافلہ نہیں رہا کہ حُدی خوانی کریں یا محمل سجالیں۔ گھڑ سواری نہیں رہی کہ شہسوار کہلائیں۔ اصل اُڑ گیا، نقل رہ گئی۔ اب ان کی رونق زبان و ادب کے محاوروں میں ہے۔ اور ان کا

استعمال ماضی کے ذہنی وتہذیبی ورثے کی لسانی روایتوں کو منتقل ہو چکا ہے۔ پہلے ان کا تعلق میدان سے تھا۔ اب وجدان سے ہے، آج زمانہ اتنا بڑھ چکا ہے کہ بہت سے ادبی محاورے اور بیسیوں ضرب الامثال زبان سے خارج کر دینے کی چیز ہو چکی ہیں۔ ان کا دور لد گیا اور ان کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اب وہ آثار قدیمہ کی طرح زبان کے فرہنگ میں رہ گئی ہیں۔

خطابت کا اطلاق (Speach Oratory) پر ہوتا ہے جو زبان کی معراج اور بیان کا معجزہ ہے۔ اس کے بعد تقریر ہی ہے جو زبان کی صناعت اور بیان کی بدایت ہے۔

خطیب میں تخلیقی جوہر ہوتا ہے۔ جو کچھ وہ کہتا، جس طرح کہتا اور جس گہرائی و گیرائی سے بولتا ہے، ایک جادو کی طرح ہے کہ دماغ و دل مبہوت و مسحور ہو جاتے ہیں۔ اس کے الفاظ و معانی وہی ہوتے ہیں جو زبان کا خزینہ اور لغت کا سفینہ ہیں۔ ان کا حُسن یہی ہے کہ خطیب بولتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ دماغوں سے اٹھا کر دلوں میں اتار رہا ہے۔ عوام محسوس کرتے ہیں کہ ان کی گمشدہ متاع مل رہی ہے اور وہ ان جواہر پاروں سے دامن بھر رہے ہیں جن کی تلاش میں تھے۔ خطیب کا اجتماعی تاثر عطیۂ الٰہی ہوتا ہے۔ اس کے الفاظ و روبست کی رو میں ذہنوں پر اس طرح بیٹھتے چلے جاتے ہیں جس طرح ایشیائی غزل سرا میں، سرگیں نگاہوں کے ڈورے، شاعرانہ طبیعتوں میں کھب جاتے ہیں۔

مقرر (Speaker) کی حیثیت خیالات وجذبات کے سفیر کی ہے۔ وہ اپنے فن کو وہبی و اکتسابی خصوصیتوں کے امتزاج سے پیش کرتا ہے۔ جو کچھ اس کے پاس ہے اس کو اچھالتا اور اُجالتا ہے۔ جس کی طلب ہے، اُس کی تصویر کھینچتا ہے۔ وہ طبیعتوں کو تیار کرتا، دماغوں کو آواز دیتا، دلوں کو گرماتا اور قدموں کو دوڑاتا ہے۔ گویا خطیب اپنے فن کی مملکت کا شہریار ہے کہ ذہنوں پر فرمانروائی کرتا ہے۔ اور مقرر میکدۂ عوام کا پیر مغاں ہے جس کے پیمانوں کی گردش تشنہ کاموں کی پیاس بجھاتی ہے۔

آج خطیب و مقرر دونوں کا رشتہ پبلک و پالیٹکس سے ہے۔ وہ خطابت کی حد تک ہر موضوع پر بول سکتے ہیں اور اپنے فن کی بدولت ہر فضا میں اُڑ لیتے ہیں۔ لیکن فی زمانہ ان کا اصل میدان عوام و سیاست ہے۔ جب انسان سیاسی نہیں تھا تو خطابت کا میدان دوسرا تھا۔ تب مذہبیات و عمرانیات خطبا کا مضمون و موضوع تھے اور خطیب و مذہب میں چولی دامن کا ساتھ تھا۔ لیکن اب تقریبات، موضوعات کی رعایت سے تقسیم ہو چکی ہیں۔ جو لوگ مذہب پر بولتے، انہیں واعظ کہتے ہیں۔ جو ذاکری کرتے ہیں انہیں ذاکر کہتے ہیں۔ بعض رعایتوں سے انہیں خطیب بھی کہا جاتا ہے۔ مثلاً خطیبِ اسلام، خطیبِ اہل بیت وغیرہ لیکن اُن کے لیے واعظ و ذاکر ہی کے لفظ جامع و موزوں ہیں۔ ان کا سرمایہ گفتار خطیبانہ خصوصیتوں کی بعض اداؤں کے ساتھ اکتسابی ہوتا ہے۔ وہ کتابوں کی زبان میں کتابوں سے بولتے ہیں۔ واعظ قرآن و حدیث، تاریخ و سیر اور شریعت و طریقت کا داستان گو ہے۔ اس کی دولت جتنی بنتی، اتنی بڑھتی ہے۔ اُس کے موضوع و مباحث عمر بھر ساتھ دے سکتے ہیں۔ مطالعہ، مشق، حافظہ، زبان اور اسلوب اس کی خطابت کے عناصر خمسہ ہیں۔ واعظوں ہی میں مناظر شمار ہوتے ہیں۔ لیکن ایک واعظ اور ایک مناظر میں وہی فرق ہے جو ایک افسانہ نگار اور ایک مقالہ نگار میں ہوتا ہے۔

خطیب، مقرر اور واعظ کے علاوہ کچھ لوگ یا اکثر لوگ محض لسان (Damaguag) ہوتے ہیں۔ ان کا انحصار الفاظ کی روانی و طغیانی پر ہے۔ اس طرح کئی لوگ محض گفتگو طراز (Conversationalist) ہوتے ہیں۔ ان کے متعلق بعض حلقوں کو خطیب و مقرر ہونے کا ذہنی مغالطہ ہوتا ہے اور وہ حلقۂ یاراں میں خطابت کا سایہ ڈال لیتے ہیں۔ لیکن ان کا فن مکالمت کا ہے۔ خطابت کا نہیں۔ وہ مجمعوں کے نہیں محفلوں کے ہوتے ہیں۔ البتہ ایک گفتگو طراز اور ایک باتونی (Conversational) میں بڑا فرق ہے۔ گفتگو طراز اپنے مطالعہ و مشاہدہ اور علم و تجربہ کے تحت عمومی و خصوصی مکالمت کرتا ہے لیکن باتونی الفاظ کے غبارے اور آواز کے کنکوّے اُڑاتا ہے۔ وہ ایک پتنگ باز، بالفاظ

دیگر چرب زبان ہے۔ اس کی زبان قینچی کی طرح چلتی اور مقراضی کی طرح کاٹتی ہے۔ اس صف میں بعض دوسرے لوگ بھی ضمناً شریک کیے جاتے ہیں۔ مثلاً یونیورسٹیوں کے بعض استاد اور عدالتِ عالیہ کے وکلا لیکن وہ ایک موقّر یا مقدس پیشہ کے نمائندے ہیں۔ وہ خطیب نہیں ہوتے۔ اس زمانہ کے علوم و فنون نے خطابت میں وسعت و تنوع ضرور پیدا کیے ہیں لیکن ایک فن کی حیثیت سے خطابت وہی ہے، جو کبھی تھی اور وہی رہے گی جو آج ہے۔ اس کا تعلق انسان کی عالمگیر سچائیوں سے ہے اور اپنے احوال و خصائص کے اعتبار سے پہاڑوں اور سمندروں کی ہم عمر ہے۔

خطیب

خطابت دعوت ہے، تقریر سفارت، ایک فن کے طور پر دونوں میں یکسانی ہے لیکن دونوں کے اظہار و اسلوب مختلف ہوتے ہیں۔ مثلاً شاعری ایک فن ہے اور ہر وہ شخص جو شاعری کا ملکہ رکھتا اور شعر کہتا ہے، شاعر ہے۔ لیکن ہر شاعر کا اسلوب و تخیل دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ ایک ہی بحر میں، ایک ہی مصرع پر جس قدر شاعر غزل کہیں گے، وہ مضمون و تخیل کے اعتبار سے یکساں نہیں ہو گی اور اگر ایک ہی خیال ہو تو ہر شاعر کے الفاظ کا پیرہن مختلف ہو گا۔ ایک ہی موضوع پر مختلف شاعر نظم لکھتے ہیں لیکن ہر شاعر کا بیان مختلف ہوتا ہے۔ ان میں تاثر و تخیل اسلوب و اظہار کی علیحدگی کے باوجود کوئی سی چیز یکساں ہوتی ہے تو وہ شاعری ہے۔ یہی حال خطیبوں اور مقرروں کا ہے کہ مجمع سے ایک ہی موضوع پر خطاب کرتے ہیں لیکن اسلوب و اظہار جداگانہ ہوتے ہیں۔ اس اختلاف ہی کا نام ہر خطیب و مقرر کی انفرادیت ہے۔ شاعر کے الفاظ میں.....ع

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

بعض سیاسی برہمیوں کے پیشِ نظر خطیبوں اور مقرروں کا انتخاب و موازنہ آسان نہیں واقعہ یہ ہے کہ سیاست کا غبار بہت سی علمی سچائیوں کے چہرے پہ چھا چکا ہے راقم نے جن جن خطیبوں اور مقرروں کو سنا یا ان سے کوئی تاثر فراہم کیا، ان کے متعلق گفتگو ہو سکتی ہے کہ سوال ان کے سیاسی سفر یا جماعتی مؤقف کا نہیں۔ ان کے فن کا سوال ہے۔ ایک دور وہ تھا جب سیّد احمد شہیدؒ اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ نے جہاد کے موضوع پر

خطابت کی شمعیں روشن کیں۔ پھر 1857ء کے لیل و نہار کا دور تھا۔ اس کے بعد علمائے صادق پور کا زمانہ آیا۔ پھر اسی دوران میں اور اس کے بعد علی گڑھ کے مدرسۂ فکر اور دارالعلوم دیوبند کے چراغ روشن ہوئے۔ سرسید احمد خان نے قلم و زبان دونوں کا دھارا موڑ دیا۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے تقریر و خطابت کے تیور بدل ڈالے۔ انڈین نیشنل کانگرس کی نیو رکھی گئی تو خطابت کا جدید دور شروع ہوا۔ پھر مسلم لیگ کے ساتھ خطابت کا رنگ بدلا۔ اُدھر مسلمانوں کے بعض تعلیمی اواروں نے خطابت کو جلا بخشی۔ ڈپٹی نذیر احمد نے تحریروں میں نام پیدا کیا۔ علامہ شبلی نعمانیؒ نے رنگ جمایا۔ اور ندوہ کی معرفت عمدہ مقرر پیدا کیے۔ یہ ایک ایسا دور تھا کہ خطابت کی جدید شاخیں سرسبز ہو رہی تھیں۔ اس کے بعد تحریکِ خلافت اور ترکِ موالات کا زمانہ آیا تو ڈھاکہ سے خیبر تک اور سری نگر سے سرنگاپٹم تک پورے ملک میں خطیبوں اور مقرروں کی ڈار پیدا ہو گئی۔ ان سب کے نام گنانا تو مشکل ہے لیکن مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی خان، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، لالہ لاجپت رائے، پنڈت موتی لعل نہرو، مولانا احمد سعید دہلوی اور مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی سرفہرست مقرر تھے۔ ان میں دو چار بڑے پائے کے عصری خطیب تھے۔ چونکہ ان کی تقریر و خطابت راقم کے مشاہدہ و تجربہ میں آئی ہے اس لیے نفسِ مضمون کی رعایت سے انہی کا تذکرہ کیا جا رہا ہے۔ اور یہ امر واقعی ہے کہ ان مقرروں نے اُردو زبان کی حد تک نہ صرف یہ کہ خطبا کی ایک نامور جماعت پیدا کی بلکہ عوام کو ایک ولولۂ تازہ دے کر، اُن میں قومی جدوجہد کے بال و پر پیدا کیے۔ ان کے علاوہ برِ عظیم کی آزادی تک مقرروں کی نوجوان کھیپ پیدا ہوتی گئی۔ اور کئی علمی شخصیتوں نے خطابت میں نام پیدا کیا۔ جن لوگوں نے سیاسی میدان میں خصوصیت حاصل کی ان میں پنڈت جواہر لعل نہرو، نواب بہادر یار جنگ، سردار عبدالرب نشتر، ڈاکٹر اشرف، منشی احمد دین اور مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی وغیرہم عوام کے دلوں میں اتر جانے کی خصوصیت رکھتے تھے۔ قائد

اعظمؒ اور مہاتما گاندھی، برِ عظیم کی دو عظیم تحریکوں کے سب سے بڑے رہنما تھے۔ انہیں راہنماؤں کے راہنما ہونے کا شرف حاصل تھا لیکن انہوں نے اپنی خطابت سے عوام کو فتح نہیں کیا۔ ان کی شخصیت کے جادو نے عوام کو مسحور کر رکھا تھا۔

مولانا ابو الکلام آزادؒ، اُردو خطابت کے لیے قدرت کا عطیہ تھے۔ ان کے لیے ہر موضوع ہاتھ کی چھڑی اور جیب کی گھڑی تھا۔ مذہب پر بولتے تو عبقریِ عصر تھے، ادب پر خطاب کرتے تو ہر ادیب و شاعر کا شعلہ گفتار کجلا جاتا۔ اور سیاست میں خطابت کے تمام اوصاف ان کے چوبدار تھے۔ اُن سے بڑا اُردو زبان خطیب پیدا نہ کر سکی۔ وہ خطابت کے افق پر صبحِ خنداں کا اجالا تھے اور الفاظ و مطالب ان کے خانہ زاد تھے۔ ان کا معاملہ خطابت کی رعایت سے انہیں کے الفاظ میں یہ تھا کہ .....ع

دعا دے مجھے اے زمینِ سخن
کہ مَیں نے تجھے آسماں کر دیا

انہوں نے ابتدائی عمر میں ڈپٹی نذیر احمد، علامہ شبلی اور مولانا حالی سے اپنی خطیبانہ صلاحیتوں پر خراج حاصل کیا تھا۔ علامہ شبلی ان کے دماغ کو قدرت کا معجزہ قرار دیتے تھے۔ مولانا محمد علی جوہر خطابت میں یکہ تاز تھے، ان کے الفاظ میں ان کا دل سلگتا اور خون بولتا تھا۔ وہ مضمون سے مضمون پیدا کرتے اور رنگارنگ کے مجمع کو اکائی بنا دیتے تھے۔ ان کی خطابت کے اجزائے ترکیبی میں اخلاص فی العمل کا ولولہ تھا۔ وہ خطابت میں تکرار پیدا کر کے عوام کو وحدت ذہنی کی طرف لے جاتے۔ مولانا ظفر علی خان، قلم کے دھنی اور زبان کے غنی تھے۔ اُن کی خطابت میں ضرب ید اللّٰہی کا بانکپن ہوتا۔ وہ زبان و محاورہ کے استاد تھے، ان کے جملے دریائی لہروں کی مانند رواں دواں ہوتے۔ سیّد عطاء اللہ شاہ بخاریؒ بے پناہ عوامی خطیب تھے۔ ان کی آواز اور لہجہ میں وہ سحر تھا کہ خصائص خطابت اس کا ہالہ تھے۔ انہیں وقت ٹھہر کر اور ہوائیں رک کر سنتی تھیں۔ وہ عقلوں کا شکار کرتے اور مجمع کو زورِ بیان سے پلٹ دیتے۔ یہ کمال ملک میں

صرف انہی کو حاصل تھا کہ عشا کی نماز کے بعد شروع ہو کر اذانِ فجر تک بولتے اور مجمع مبہوت ہوتا۔ انہوں نے کئی مجمعوں کو تحریک بنادیا اور جو لوگ تقریر سننے آتے تھے وہ مظاہروں کی شکل اختیار کر کے جیل چلے گئے۔ ان کے سامنے شاذ ہی کسی دوسرے خطیب یا مقرر کو بولنے کا یارا ہوتا۔ اُن کی آواز میں دوشیزۂ فطرت کا حُسن اور سخن داؤدی کا آہنگ تھا۔ ڈاکٹر سیف الدین کچلو کی خطابت میں اس طرح زیر و بم ہوتا گویا وہ ان کی آواز اور لہجے کے مرہون ہیں۔ ان میں عوام کے دماغوں سے کھیلنے کا جوہر تھا۔ وہ شعلہ کی طرح بھڑکتے اور رعد کی طرح کڑکتے۔ لالہ لاجپت رائے بولتے تو محسوس ہوتا کہ اَنی تلواریں تنی ہوئی ہیں۔ ان میں پکار اور للکار دونوں تھے۔ پنڈت موتی لعل نہرو میں صبا کا خرام اور آبشار کا جھالا تھا۔ آواز میں نفاست اور لہجہ میں تمکنت ان کا سنگار تھے۔ مولانا احمد سعید دہلوی قلعہ معلّٰے کی زبان میں خطاب کرتے، روزمرہ اور محاورہ ان کی تقریر کا زیور تھے۔ وہ چھوٹے چھوٹے فقروں میں بڑی بڑی باتیں کہتے اور عوام کے دلوں کو غنچوں کی طرح کھلاتے تھے۔ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، اعتماد و اعتقاد کے لہجہ میں گونج اور گرج کے خطیب تھے۔ ان کی تقریریں اعجاز و اختصار کا مرقع ہوتیں۔ سب سے بڑی خوبی ان کا برجستہ پن تھا۔ پنڈت جواہر لعل نہرو زبان سے اٹھکیلیاں کرتے اور لہجہ کے نشیب و فراز کو اپنی شخصیت سے متاثر کرتے تھے۔ ان کے فقرے گنگا اور جمنا کی طرح مصفا ہوتے۔ سامعین محسوس کرتے کہ ان کی سماعت یاترا کر رہی ہے۔ نواب بہادر یار جنگ خطابت کے سینا پر جلوہ دکھا کر شعلۂ مستعجل ہو گئے۔ اُردو ایک عظیم الشان خطیب سے محروم ہو گئی۔ ان کی آواز میں لَنک اور کھنک کا جوہر نمایاں تھا۔ وہ الفاظ و مطالب کے آمیختہ سے سامعین کی طبیعتوں میں غرور پیدا کرتے تھے۔ سردار عبدالرب نشتر، مولانا محمد علی جوہرؔ کے شاگرد تھے۔ ان کی خطابت میں ٹھہراؤ اور اٹکاؤ انگوٹھی کے نگینے کی طرح تھا۔ منشی احمد دین پنجاب سوشلسٹ پارٹی کے جنرل سیکرٹری تھے۔ انہیں سیّد عطاء اللہ شاہ بخاریؒ سے تلمذ تھا۔ وہ برِ عظیم کی تقسیم سے

پہلے، اپنے عقائد کی بنا پر مسلمانوں کی ناراضی اور آزادی کے بعد ہندوستان کی ناقدری کا شکار ہو گئے ورنہ ایک جواں سال خطیب تھے اور بولتے ہوئے موتی رولتے تھے۔ ان میں ایک مقرر کے سبھی اوصاف تھے، ڈاکٹر اشرف میں زبان کا جمال اور بیان کا جلال تھا، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی "جمعیۃ العلمائے ہند کے ملازم تھے۔ وہ مشاطۂ گفتار کو الفاظ سے شانہ کرتے اور کاکلوں کی طرح مطالب کو پھیلا دیتے تھے۔

چونکہ خطابت قلم کی نہیں زبان کی چیز ہے اس لیے اس کا تذکرہ اور موازنہ ایک قاری کے ذہن میں صحیح تصویر پیدا کرنے سے قاصر ہے۔ جو چیز سمع کی ہے وہ سامع ہی کو صحیح تاثر دے سکتی ہے۔ اوّل تو ان خطبا کی تقاریر و خطابت مدوّن ہی نہیں ہیں، اور اگر دو ایک کے خطبات و تقاریر مرتب ہیں تو وہ ان کی خطابت کا سوواں حصہ بھی نہیں۔ ان کی سیاسی شخصیت کے باعث تاریخی ضرورت کی غرض سے بعض خطبات کی تلخیصات جمع کر دی گئی ہیں یا وہ خطبات ہیں جو تحریری طور پر کسی قومی مجلس میں صدارتی تقریر تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ تقاریر و خطابت اپنے تمام خصائص کے ساتھ قلم بند نہیں ہو سکتے۔ نہ ان میں زبان و لہجہ کا اتار چڑھاؤ آسکتا ہے نہ تاثر و تاثیر کی خصوصیتیں حوالۂ قلم ہو سکتی ہیں۔ اور نہ مطبوعہ تقاریر سے کسی مقرر کے خطیبانہ اوصاف کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ چونکہ شاعری ایک تحریر ہے اور شاعر خلوت میں عوام سے ہمکلام ہوتا ہے۔ اس لیے خطابت کی فنی وحدت اور اسلوب کے تنوّع کا اندازہ مختلف العصر شاعروں کے موازنے سے کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً میرؔ، غالبؔ، حالیؔ، اکبرؔ، اقبالؔ، ظفر علی خان، حسرتؔ، جوشؔ، فانیؔ، جگرؔ، اختر شیرانیؔ، فیضؔ اور احسان دانشؔ اجتماعی حیثیت میں اپنے ادوار و دوائر کے شاعر ہیں۔ لیکن ایک کی صدا دوسرے سے مختلف اور ایک کا رنگ دوسرے سے جدا ہے۔ ان کے تخیل اور ان کی ہیئت میں اختلاف ہے۔ ان کے اسالیب و مطالب میں فاصلہ ہے۔ ان کے رشحاتِ قلم سے قارئین و سامعین میں رنگا رنگ تاثرات پیدا ہوتے ہیں۔ میرؔ میں عشق کی لپک اور درد کی کسک ہے۔ غالبؔ میں خیال کی گیرائی اور

احساس کی گہرائی ہے۔ حالیؔ نے شاعری کا مزاج بدلا اور قومی اصلاح کی نیو اٹھائی۔ ان کے لہجہ میں پکار ہے، للکار نہیں۔ وہ ہندوستان میں مسلمانوں کے ہمہ پہلو انحطاط کے عزادار تھے۔ اکبر الہٰ آبادی برطانوی اقتدار کی ذہنی قتل گاہ میں ہندوستانی مسلمانوں کی تہذیبی و تعلیمی ویرانیوں کے طناز تھے۔

گہے خندہ او چوں تیغ اصیلے
گہے گریہ او چوں ابرِ بہارے

اقبالؔ عربی لہجہ میں عجمی آواز تھے۔ ان کا نصب العین مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ تھا۔ انہوں نے مغربی افکار کی بالادستی پر زبردست تنقید کی۔ ان کا نصب العین توحید و رسالت سے غیر متزلزل وابستگی کی بنا پر، قرنِ اوّل کی روایتوں کا احیا تھا۔ ان کی شاعری زوال آمادہ مسلمانوں کے میدانِ حشر میں صُورِ اسرافیل ہے۔ ظفر علی خان مورچوں کے شاعر تھے۔ وہ ہم خیال تحریکوں کے لیے آب و دانہ مہیا کرتے اور پسندیدہ شخصیتوں کے لیے رطب اللسان ہوتے۔ جن تحریکوں سے اختلاف کرتے ان پر لعن و طنز سے خشت باری کرتے اور جن شخصیتوں سے اختلاف کرتے ان کی قدح میں ہجو تک چلے جاتے۔ ان کا اشہبِ قلم قدح و مدح کے میدانوں میں فراٹے بھرتا تھا۔ جوشؔ فی الواقعہ ایک انقلابی شاعر تھے۔ انہوں نے زبان و بیان میں ایک گونج اور اظہار و اسلوب میں ایک گرج پیدا کی۔ ان کی شاعری پر توڑ پھوڑ کا مزاج غالب رہا اور وہ معنوی اعتبار سے احتجاج کے شاعر تھے۔ ان کے کلام میں سیاست کی امنگ اور خطابت کی ترنگ ہے، انہوں نے شاعری کو جری لہجہ دے کر شاعری کے کھنڈروں کو توڑ ڈالا اور اس انداز سے میدان رستاخیز پیدا کیا کہ شاعری کے لیے ذہن انہی کے ہو گئے۔ پھر ان کی وجہ سے جدید ادب کی راہیں کھلیں اور اسلوبِ نظم کی ایک طاقت ور فضا پیدا ہو گئی۔ جب 1857ء کی آخری ہار کے ہاتھوں مسلمان قوم مغلوب ہو گئی تو عوارض کا ایک طوفان اٹھا۔ ان میں ذہنی عارضہ بھی تھا۔ جس نے لکھنؤ اور دہلی کی شاعری کو

جسمانی عیش سے مضروب کیا۔ داغؔ اس میلان ورجحان کے نمائندے تھے۔ غزل کا مزاج عشق کی بجائے ہوس کا ہو گیا۔ حسرتؔ موہانی نے اس مزاج کو اس خوش اسلوبی سے الٹایا کہ غزل عشق کی ہو گئی اور مزاج کی آوارگی کا خاتمہ ہو گیا۔ حسرتؔ نے مفروضوں کی بجائے حقیقتوں کا ناد پھونکا اور ان تمام روایتوں سے بغاوت کی جن کا انحصار جسم کے لمس پر تھا۔ فانیؔ اور جگرؔ کا اسلوب ممیز تھا۔ اول الذکر عشق کی نذر ہو گئے۔ مؤخر الذکر نے عمر کی تھکاوٹ تک عشق کی وادیاں قطع کیں لیکن دونوں نے غزل کی ہلکی ہلکی آنچ میں تیز تیز حرارت پیدا کی۔ فانیؔ حسرتوں کے شاعر تھے، جگر مسرتوں کے، انہوں نے غزل کے مے کدے میں رونق پیدا کی اور اس معشوق کو رخصت کر دیا جو اسلاف شعرا کا مرجع محبت تھا۔ اختر شیرانی گوشت پوست کا رومانی شاعر تھا۔ اس نے اُردو میں عربی شاعری کی روایت پیدا کی اور سلمٰی و عذرا سے عشق کیا لیکن عفتِ قلم کو مجروح نہ ہونے دیا۔ اس کی شاعری اسی سے شروع ہو کر اسی پر ختم ہو گئی۔ احسانؔ دانش نے ہر شاعر کے تتبع میں اجتہاد کیا، پھر خود ایک انفرادیت کی راہ پر آ گیا۔ اُس نے الفاظ سے پورا پورا فائدہ اٹھایا لیکن جوشؔ کی طرح نہ تو خدا سے بغاوت کی اور نہ مذہب سے انحراف کیا۔ اس کی فکر اسلامی ہوتی گئی اور سرمایہ و محنت کی کشمکش میں، مزدور شاعر کی حیثیت سے نمایاں ہوتا گیا۔ اسی نسبت سے وہ جنگ و جدل کا شاعر ہے۔ فیضؔ کی شاعری میں رومانی صدموں اور معاشی سانحوں کی پکار ہے۔ وہ اسی ذہنی فضا کا عظیم شاعر ہے اور اس کے افکار پر اشتراکیت کی گہری چھاپ ہے۔ ان سب کو جو چیز ایک ہی فضا میں کھڑا کرتی ہے وہاں کا شاعر ہوتا ہے۔ ہم ان کے مجموعہ ہائے کلام سے ان کی انفرادیت کا تعین کر کے اُن کا اوصاف کا تجزیہ کر سکتے ہیں جو اُن کے اسلوب و اظہار کا امتیاز ہیں۔ کچھ ایسی ہی چیز، ایک بنیادی فرق کے ساتھ خطبا میں ہوتی ہے۔ مثلاً موضوع ایک ہوتا ہے لیکن ہر خطیب اُس پر جداگانہ انداز میں بولتا اور اپنی انفرادیت سے مقصد میں یکسانی پیدا کرتا ہے۔ لیکن جو چیز بعض خصوصیتوں کی یکسانی کے باوجود،

خطیب کو دوسروں سے ممتاز کرتی ہے، وہ اس کی سیرت ہے۔ اگر ایک خطیب یا مقرر واغدار سیرت رکھتا ہے اور اخلاق سے معریٰ ہے تو وہ کامیاب مقرر نہیں ہو سکتا۔ اور نہ اس کی طلاقت لسانی عوام میں وہ اثر پیدا کر سکتی ہے جو خطابت کے فن کی طلب یا تاثیر ہے۔ خطابت کی اصل بنیاد خطیب کی سیرت ہے۔ اگر خطیب کے دامن پر کوئی دھبہ ہے یا وہ اخلاق کی ابدی قدروں میں سے کسی ایک قدر سے محروم ہے، تو وہ عزت مند نہیں ہو سکتا۔ اور ایک خطیب کے لیے عزت مندی ہی قبولِ عامہ کی اساس ہے۔ اس اعتبار سے خطابت ایک خار دار وادی ہے جس سے صحت مند قدم ہی گزر سکتے ہیں۔ اکثر شاعر لھو ولعب کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ہمارے زمانہ میں دو چار شاعروں کو چھوڑ کر اکثر شاعروں نے ناؤنوش کی زندگی بسر کی اور بعض نے اس پر فخر کیا لیکن عوام نے کبھی ان سے تعرض نہیں کیا۔ اسی طرح مصوّر و موسیقار اور ادیب و فنکار انہی راستوں کے مسافر رہے ہیں۔ انہوں نے معصیت کے لمحوں کو اپنی کلاہِ افتخار میں ٹانکا ہے۔ لیکن خطیب یا مقرر کسی معصیت یا گناہ کا تصور بھی کریں اور ان کا ذائقہ چکھنا چاہیں اور وہ عوام کے علم میں ہو تو وہ عوام میں ایک آدھ پھیرا ڈال سکتے ہیں لیکن عوام میں ٹھہر نہیں سکتے۔ ان کی شخصیت کا ڈھلنا خارج از امکان اور قبولِ عامہ کا حصول ناممکن ہے۔ خطیب کی سیرت اس کی دولت اور اُس کا کیریکٹر اُس کا خزانہ ہے۔ جو خطبا اور مقرر اس سے محروم ہوئے وہ دماغوں اور دلوں پر کوئی نقش نہیں جما سکتے۔ ان کی حیثیت زیادہ سے زیادہ اُس خوش آواز گداگر کی ہوتی ہے جو مکانوں کی چوکھٹ پر صدا دیتا اور ناکام لوٹتا ہے۔ یا پھر وہ اس ڈھولک کی تھاپ ہے جو بالا خانوں پر بجتی ہے اور رات کی چمک دمک گزارنے کے بعد تماشائی کے لیے منتشر و مضمحل صبح لے کر طلوع ہوتی ہے۔ خطابت بدن ہے تو سیرت اس کی رُوح ہے۔ خوبصورت رُوح ہی تندرست بدن قائم رکھتی ہے۔ کسی فن میں سیرت اس شدت سے معیوب نہیں ہوتی جس شدت سے خطابت میں اس کی پرکھ ہوتی ہے اور ایک خطیب کے اعمال پر عوام کی نگاہ رہتی

ہے، اگر کوئی خطیب یا مقرر پبلک لائف بسر کرنا چاہتا ہے تو لازم ہے کہ بے داغ کیریکٹر رکھتا ہو۔ اور اس کی سیرت لہو ولعب کے چھینٹوں سے محفوظ۔ ایک خطیب اپنے لیے یہ تخلیہ قائم نہیں کر سکتا کہ عوام کی زندگی اور نجی زندگی میں کیا فرق ہے۔

ایک خطیب میں درج ذیل کے اوصاف کا ہونا ضروری ہے۔ ان کے امتزاج ہی سے اس کی شخصیت استوار ہوتی ہے:

1۔ بے ریا کردار	2۔ بلند نصب العین
3۔ اخلاص فی العمل	4۔ صداقت شعاری
5۔ شخصی وجاہت	6۔ باخبر ذہن
7۔ نستعلیق اشارات	8۔ طلاقتِ لسانی
9۔ بے عیب آواز	10۔ صحیح تلفظ
11۔ حاضر جوابی	12۔ برجستہ گوئی
13۔ موقع شناسی	14۔ وحدت مقصد
15۔ ہمدردی وپامردی	16۔ مجمع کی نفسیات سے آگاہی
17۔ فہم عامہ ومہارتِ تامہ	18۔ مطالعہ کی چٹک
19۔ مشاہدہ کی لگن	

کسی رعایت سے یہ کوئی نصاب نہیں کہ علیحدہ علیحدہ مضامین کی الگ الگ تعلیم حاصل کی جائے۔ اور نہ ان کے لیے کسی تیاری کی ضرورت ہے۔ یہ تمام اوصاف ایک مقرر میں خود بخود رچ بس جاتے ہیں۔ کچھ اوصاف وہبی ہوتے ہیں۔ کچھ اکتسابی، ان دونوں کی یکجائی سے خطیب و مقرر تیار ہوتے ہیں اور ان کا ایک جیتا جاگتا پیکر بن جاتا ہے۔ اسی سلسلہ میں ایک دماغی ارادہ اور ایک قلبی شغف راہنما ہوتا ہے۔ جب ایک انسان اپنے ملکۂ وہبی کی تحریک پر خطیب بننے کا عزم کرتا ہے تو یہ اوصاف اس میں اسی طرح پیدا ہوتے ہیں جس طرح ایک ہی لحظہ میں رنگارنگ جلوے نگاہوں سے گزرتے

اور اپنی بوقلمونی کا اشتہار پیدا کرتے ہیں۔

یہ بحث آ چکی ہے کہ خطیب و مقرر کی سیرت اس کی پہلی بنیاد ہے۔ ان کا دماغ خیالات و نظریات کی جلوہ گاہ ہوتا ہے۔ ہم اُسے ایک ایسی لائبریری سے تشبیہ دے سکتے ہیں جس میں خیالات، نظریات، تصورات، احساسات، مشاہدات، مطالعات اور تجربات کے مرقعے پڑے رہتے ہیں۔ پھر خطابت کے مرحلے میں موضوع کی رعایت سے خود بخود کھلنے چلے جاتے اور حافظہ کے طاقوں پر رکھی ہوئی معلومات نوکِ زباں ہو جاتی ہے۔ ایک خطیب، شاعر، ادیب، صحافی، نقاد، مغنّی اور پلیڈر نہیں ہوتا اور نہ ہر خطیب قائد ہوتا ہے۔ بعض خطبا میں اس انداز کی ایک دو خوبیاں جمع ہوتی ہیں۔ جن خطبا نے تحریکِ خلافت اور ترکِ موالات کے زمانہ میں نام پیدا کیا، ان میں کئی سربرآوردہ خطبا انہی خوبیوں کے حامل تھے۔ اور سرفہرست خطبا ان اوصاف کا مجموعہ تھے لیکن ایک خطیب اور ایک مقرر میں شاعر کا ہمہمہ، ادیب کا طنطنہ، صحافی کا دغدغہ، نقاد کی نگاہ، مغنّی کا سوز، وکیل کا استدلال اور قائد کا شعور اس طرح سمو جاتے ہیں کہ دلوں کے دروازے کھلتے اور طبیعتوں کا انجماد ٹوٹ جاتا ہے۔ پھر دماغوں کے طاق جگمگانے لگتے ہیں۔

مطالعہ و مشاہدہ خطابت کے سونے کا سہاگہ ہیں۔ بسا اوقات طبیعت کا وہی جوہر سہاگہ ہوتا ہے اور مطالعہ و مشاہدہ سونا ہوتے ہیں۔ ایک خطیب و مقرر کے لیے حاصل مطالعہ اتنا ہی ضروری ہے جتنا بدن کو زندہ رکھنے کے لیے غذا اور پیاس کو مٹانے کے لیے پانی، ایک خطیب کے لیے مطالعہ اس کی غذا ہے۔ اس کا فرض ہے کہ مطالعہ اس کا معمول ہو اور وہ جس طرح غذا اور پانی کے بغیر دن گزار نہیں سکتا، اس طرح مطالعہ کے بغیر یہ محسوس کرے کہ اس کا دماغ آج بھوکا رہا ہے۔ جو مقرر یا خطیب مطالعہ سے ہاتھ اٹھا لیتے ہیں خواہ اس خیال سے کہ انہیں مطالعہ کی ضرورت نہیں رہی اور وہ خطابت کی معراج پر ہیں تو ممکن ہے انہیں کچھ عرصہ مطالعاتی خلا کا احساس نہ ہو لیکن وہ

مطالعہ سے بچھڑ اور مشاہدہ سے بچھڑ کر خیالات میں ضعف کا شکار ہوتے اور اُن کی خطابت کو لونی لگ جاتی ہے۔ محض ماضی کوئی چیز نہیں اور نہ اس طرح زندگی گزر سکتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ انسان کو اپنے ماضی سے محبت ہوتی ہے اور ماضی کی سرگزشت اس میں تحریک پیدا کرتی ہے۔ لیکن خطابت حال سے جوان ہوتی اور مستقبل کو پروان چڑھاتی ہے۔

یہ سوال کہ ایک خطیب کو کیا پڑھنا چاہیے؟ ظاہر ہے کہ جو موضوع یا مضمون اس کے پیشِ نظر ہیں، اس کا مطالعہ اسے ضرور کرنا چاہیے اور وہ اوصاف جو خطابت کو جلا دیتے ہیں۔ ان سے کسی لحظہ غافل نہ رہنا چاہیے۔ ایک مقرر یا خطیب کو ابتدا میں کبھی کچھ پڑھنا چاہیے تاکہ اس کی معلومات و خصوصیات کسی پہلو سے تشنہ نہ رہیں۔ اور نہ اس سلسلہ میں کوئی سا گوشہ ادھورا رہ جائے۔ ایک خطیب و مقرر کو مختلف استعداد کی مختلف طبیعتوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ پھر ان کی سطح پر جا کر انہیں اسی سطح پر لانا ہوتا ہے۔ جو مقرر یا خطیب عوام کے احساسات سے بے خبر ہو، وہ انہیں اپنی سطح پر نہیں لاسکتا۔ عوام کے ذہنی احساسات میں گھل مل کر ان کے دماغوں میں اپنے خیالات اتارے جاسکتے اور ان کے دلوں پر تھپکی دی جاسکتی ہے۔ اپنی ذہانتوں اور بلوغتوں کے باوجود ایک مجمع، خطیب کے لیے بچّے کی مثال ہیں۔ اس بچّے کو پچکارنا، سہلانا اور پھسلانا، پھر اس کا رینگنا، اس کو اٹھانا، چلانا اور دوڑانا، خطابت کا جوہر ہے۔ اور ایک معجز بیان خطیب کی یہی خوبی اس کو ممیز کرتی ہے۔ ایک ایسا شخص کبھی کامیاب مقرر نہیں ہوسکتا اگر عوام کی نفسیات کے علم سے محروم ہے۔ وہ جس موضوع یا مضمون پر بولنا چاہتا ہے اس سے بے بہرہ ہے۔ اور صرف خطابت کے بل پر خطاب کرتا ہے تو وہ کچھ دیر کے لیے جذبات میں ہیجان پیدا کرسکتا ہے۔ لیکن خیالات میں اس سے کوئی سی رونق پیدا نہیں ہوتی۔ جو لوگ کچھ حاصل کرنے کے لیے آتے وہ تشنہ رہتے ہیں اور وہ مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے جو موضوع کے زیرِ عنوان اجتماع کا باعث ہوتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ

مطالعہ بکھر ا ہو چکا ہے اور ایک مضمون میں بے شمار مضمون ہیں۔ آج کی دنیا مضامین و موضوعات سے لدی پھدی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ایک ہی مضمون میں عمر کھپ جاتی ہے اور کوئی انسان تمام موضوعات پر حاوی نہیں ہو سکتا۔ ایک خطیب و مقرر کا بنیادی فرض ہے کہ وہ تمام موضوعات سے ایک حد تک بہرہ یاب ہو اور سیاسی و عمرانی زندگی کے اہم مضامین سے آشنا رہے۔ ہر نوعی معلومات میں افزائش کا تسلسل ہی اظہار و اسلوب میں رونق پیدا کرتا ہے۔

سب سے پہلی چیز جو مقرر کے لیے خطابت کی رُوح ہے اور جس سے اُس کا جسم نمو پاتا ہے وہ زُبان ہے۔ ایک خطیب و مقرر کے لیے زُبان کا حصول اسی طرح ضروری ہے جس طرح زندگی کے لیے سانس لینا۔ جب تک زُبان کے نشیب و فراز سے مقرر و خطیب آگاہ نہ ہوں اور اس کے قواعد و ضوابط ان کے ذہنوں میں نقش نہ ہوں، وہ اظہار و اسلوب کی نزاکتوں اور آواز و تلفظ کی نزہتوں سے بہرہ مند نہیں ہو سکتے۔ ان کے لیے حصولِ زُبان کے بغیر مطالعہ، مشاہدہ اور استعداد سب بیکار ہیں۔ ایک مقرر کے لیے زُبان کو بطور زُبان جاننا ضروری ہے۔ پہلے زُبان، پھر موضوع، جس طرح موضوع کے بغیر زُبان محض صدا ہے۔ اسی طرح زُبان کے بغیر موضوع کوئی چیز نہیں۔ دونوں میں رُوح و بدن کا رشتہ ہے۔ رُوح بدن چاہتی اور بدن، رُوح چاہتا ہے۔ ایک مقرر کے مطالعہ کی مختلف شاخیں ہیں۔ اس بحث سے قطع نظر کہ مطالعہ کس ترتیب سے ہو، پہلے کیا پڑھا جائے اور پھر کیا پڑھا جائے۔ ایک مقرر و خطیب کے لیے تاریخ کا مطالعہ بہت سی وسعتیں پیدا کرتا ہے۔ تاریخ خطابت کے لیے ریڑھ کی ہڈی ہے۔ قرآن نے تاریخ کو ایام اللہ سے تعبیر کیا ہے اور اسی کا نام انسان کا حافظہ ہے۔ گویا تاریخ ان کی سب سے بڑی میراث ہے۔ اس کی بدولت ہمیں وہ سب کچھ ملتا ہے جو کائنات کی تکوین سے لے کر کائنات کے اس سفر تک کی سرگزشت ہے۔ اس کی معرفت ہم قوموں کے عروج و زوال سے آگاہ ہوتے، انسان کے تجربوں کا علم حاصل

کرتے، جہد للبقا کے اسرار و رموز پہچانتے، فلاسفہ کی وادیاں قطع کرتے، مذاہب کے مرغزاروں میں گھومتے، عبر و بصائر کی راہوں سے نکلتے اور سوانح و افکار کے چمنستانوں میں گُل گشت کرتے ہیں۔ تاریخ ہمیں ہر دور میں لے جاتی ہے۔ وہ پہاڑوں پہ چڑھاتی، سمندروں میں گھماتی اور صحراؤں میں پھراتی ہے۔ ہم تاریخ کے مطالعہ سے فکر و نظر کی بصیرت حاصل کرتے اور شعور و ادراک کے معدنوں سے فیض یاب ہوتے ہیں۔ اس کے مطالعہ ہی سے تجزیہ و تحلیل کی ذہنی قوت پیدا ہوتی ہے اور کئی مقفل دروازے کُھلتے ہیں۔ غرض تاریخ سے ہم سخن ہائے گفتنی میں استدلال پیدا کرتے، خیالات کا وزن بڑھاتے اور نظائر و شواہد اور حکایات و تمثیلات سے کلام میں رونق پیدا کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک مقرر کے لیے منطق و فلسفہ کا جاننا ضروری ہے۔ اور یہ خطیب کے منطقی یا فلسفی ہونے کا سوال نہیں۔ مطلب ہے کہ ان مضامین سے آشنائی، خطیب کے اسلوب و استدلال کی طاقت ہوتی ہے اور اس سے خطابت میں حُسن و اہتزاز پیدا ہوتا ہے۔ مطالعہ ایک فقید المثال گلستان ہے۔ اس میں لاتعداد روشیں اور بہت سے تختے ہیں۔ ان سب کا احاطہ کرنا مشکل ہے لیکن ایک خطیب کے لیے ہر روش پر ٹہلنا ضروری ہے۔ جن مضامین کو زندگی میں خصوصیت حاصل ہے اور جو اُس کے شب و روز سے مربوط ہو چکے ہیں، ان کا مطالعہ مقرر کی اساسی ضرورت ہے۔ مثلاً معیاری تذکروں، وقیع سوانح عمریوں اور مستند سفر ناموں کا مطالعہ انتہائی مفید ہے۔ ان سے معلومات حاصل ہوتیں، زبان ملتی اور بیان کھلتا ہے۔ اس کے علاوہ تجربہ و تمثیل مشاہدہ و اسلوب کا علم ہوتا اور ذوق و شوق کے راستے کُھلتے ہیں۔ ایک مذہبی مقصد کے لیے دین کا ہمہ جہت، مطالعہ لازم ہے۔ اس کے بغیر وہ ایک سبیل ہو سکتا ہے چشمہ نہیں۔ اور چشمہ کے بغیر مجمع کی تشنیاں سیراب نہیں ہوتیں۔ ایک سیاسی مقرر کے لیے سیاسی ادب کا مطالعہ ناگزیر ہے اس سے محروم رہ کر وہ چمک نہیں سکتا۔ اور نہ اس طرح عوام میں تاثر پیدا ہو گا۔ اس کے لیے معیاری مسائل اور ثقہ اخبارات کا مطالعہ لازم و ملزوم

ہیں۔ جب تک سیاست کی روز مرہ رفتار سے باخبر نہ ہو وہ نہ تو اپنے فن سے انصاف کر سکتا ہے اور نہ اس کی تقریر اپنے موضوع میں جامع ہو سکتی ہے۔ کسی مقرر کا بلا مطالعہ تقریر کرنا، ایسا ہی ہے جیسا بہار کے بغیر بسنت منانا، یا لُو میں پتنگ اُڑانا۔ اس سلسلہ میں ایک دوسری چیز یہ ہے کہ مطالعہ کی حدود میں ہم اونے پونے مصنفوں اور مریزہ کبدار کتابوں سے اپنے مطالعاتی ذہن کا زیاں کرتے ہیں۔

ہر کتاب مطالعہ کے لائق نہیں ہوتی اور نہ ہر مصنف، مصنف ہوتا ہے۔ کئی لوگ قلم سے مذاق کرتے ہیں۔ اُن کے نزدیک قلم کی ابکائیاں اسلوبِ نگارش ہیں۔ اسی طرح بعض ادیب و شاعر اور مصنف و مؤلف حلقۂ یاراں کی بدولت شہرت پا جاتے اور انجمن ستائش باہمی کی بیساکھیوں کے سہارے قد آور ہوتے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے ممکن ہے کسی ذہنی عیاشی کا سروسامان ہو لیکن علم و خبر اور فکر و نظر کے باب میں کورے رہتے اور اکثر و بیشتر زبان و بیان کے رخنوں کا شکار ہوتے ہیں۔ کئی دفعہ غیر معروف اہل قلم کے رشحاتِ فکر، اسلوب و اظہار کی رفعت اور سوچ و بچار کی نزہت کا باعث ہوتے ہیں۔ بہر حال مطالعہ کے لیے اُردو اور انگریزی کے ذخائر میں کمی نہیں اور جو لوگ عربی فارسی سے آشنا ہیں وہ ان کے خزانوں سے کماحقہٗ فائدہ اٹھا سکتے ہیں بلکہ جن لوگوں کو اُردو خطابت میں دستگاہ ہے وہ عربی و فارسی کے فیضان سے بہرہ مند ہیں۔

انگریزی ایک عالمی زبان ہے۔ اکثر خطبا اس کے خزانوں سے مستفید ہوتے ہیں۔ ایک دوسری چیز جس نے اُردو کے خطبا کا لب و لہجہ مجروح کیا ہے اور ان کے زبان و بیان میں اکا دُکا پیوند محسوس ہوتے ہیں تو اس کی بہت سی وجوہ ہیں۔ ایک یہ ہے کہ وہ انگریزی میں پڑھتے، پنجابی میں سوچتے اور اُردو میں بولتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ اُردو کے وہ رشتے جو عربی و فارسی کے ساتھ تھے، ایک عرصہ سے کمزور پڑتے جا رہے ہیں۔ ہمارا دماغ انگریزی اصطلاحوں کا شکار ہے اور ہماری زبان پر انگریزی الفاظ اس طرح چڑھے ہوئے ہیں جس طرح حافظ میں اساتذہ کے تیر و نشتر ہوتے ہیں۔ سب سے بڑی

مصیبت یہ ہے کہ اُردو کے جدید اہل قلم انگریزی خیالات میں لتھڑ چکے ہیں۔ اُن کے ژبان و بیان میں رعنائی و زیبائی نہیں۔ ان حالات میں اُردو کے قدیم ادب (کلاسیکل لٹریچر) کا مطالعہ ہی ژبان و بیان کی دلفریبی کا باعث ہو سکتا ہے۔ ورنہ تقریر و خطابت میں سلاست و طلاقت کا پیدا ہونا ممکن نہیں اور نہ اُردو کی توانائی قائم ہو سکتی ہے اس زمانہ کے نوجوان ادیبوں اور ان کے معمر رہنماؤں کی گلکاریاں (بہ استثنا) ہمارے لیے ژبان و بیان کے اعتبار سے کھنڈر ہیں۔ ان کا مطالعہ و سفر ہمارے لیے کوئی سی لذت پیدا نہیں کرتا۔ اس کے برعکس متقدمین کی ڈار میں ژبان و بیان کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ ان کے رشحاتِ قلم سے ہم خطابت کے خصائص پا سکتے ہیں۔ اب بھی 1857ء کے گئے گزرے دور کی بعض کتابیں مطالعاتی رونق پیدا کرتی ہیں۔ کچھ ہی کہہ لیجیے لیکن فورٹ ولیم کالج کلکتہ اور نول کشور پریس لکھنؤ نے اُردو کو جس طرح محفوظ کیا، اس سے ہم محظوظ ہوئے اور اس سرمایہ سے کام و ذہن کو لذت یاب کیا۔ غالب کے خطوط، سر سیّد کے مقالات، حالی کی مطبوعات، محمد حسین آزادؔ کے رشحات، شبلی نعمانی کی تصنیفات، ڈپٹی نذیر احمد کی نگارشات، ان کے بعد وسط کا زمانہ، جس میں عبدالحلیم شررؔ، راشد الخیری، رتن ناتھ سرشار، منشی سجاد حسین وغیرہم پیدا ہوئے اور قلم کے موتیوں کے ڈھیر لگا دیے۔ پھر جنگِ بلقان سے کچھ پہلے اور اس کے بعد ابوالکلام آزادؔ، محمد علی جوہرؔ اور ظفر علی خان وغیرہم کے خامہ ہائے عنبر شامہ کی آتش باریاں، اور آزادی سے پہلے دارالمصنفین اعظم گڑھ، جامعہ ملیہ دہلی، اور علی گڑھ یونیورسٹی کے یگانۂ عصر اہل قلم کی تالیفات و تحریرات، اس دوران ہی میں خواجہ حسن نظامی، قاضی عبدالغفار، عبدالمجید سالک، غلام رسول مہرؔ، مولوی عبدالحق اور چراغ حسن حسرت کی سنجیدہ و تبسّم تحریریں فی الواقعہ اُردو ادب کا بے مثال سرمایہ ہیں۔ اس گنج شایگاں کی واحد خوبی یہ ہے کہ ہم اس کے بڑے حصّہ سے ہر دور میں مستفید ہو سکتے ہیں۔ اسی دور میں اُردو کے بڑے بڑے شاعر پیدا ہوئے اور انہوں نے شاعری کے شگفتہ میدانوں میں کئی

اختراعیں وایجادیں کیں۔ حتیٰ کہ ان کا اجتہاد قوم کے مستقبل کا نوشتہ ہو گیا۔ ان کے بعد نئے شاعروں نے جنم لیا۔ اور اردو میں نظم معریٰ اور نظم آزاد کے تجربے کرنے لگے۔ چونکہ ان کے تجربوں کو اردو کی روایتوں سے کوئی تعلق نہ تھا اور نہ قوم ذہنی طور پر ان سے مانوس تھی، اس لیے وہ تجربے حافظہ سے لاتعلق رہ کر فنا ہو گئے۔ اُن کے مصنّفوں کو ان تجربوں کے اشعار ہونے پر اصرار تھا لیکن معنوی اعتبار سے خود ان کے لیے اجنبی تھے۔ ان کے مقابلہ میں پہیلیاں زیادہ بامعنی ہیں۔ کوئی مصنّف ومؤلف ان کے اشعار کو اپنی تحریر میں استعمال کرنے کا حوصلہ نہ کر سکا اور نہ کسی مقرر وخطیب نے ان سے فائدہ اٹھایا کیونکہ وہ ان کے لیے چیستان تھے۔ اور عوام کے لیے زُبان کا اضحوکہ یا پھر شاعری کی اُلش تھے۔

جن مصنّفین کا اوپر ذکر کیا ہے ہم ان سے تحریر وانشا کے علاوہ تقریر وخطابت میں بہت کچھ حاصل کر سکتے ہیں۔ وہ تمام اہل قلم جو دوسری جنگِ عظیم کے زمانہ میں ابھر کر پاکستان اور ہندوستان کی آزادی میں جوان ہوئے۔ ان کے قلم ابھی تک انشا کی بھول بھلیاں میں ہیں۔ وہ جدّت کی آڑ میں بدعت کا شکار ہیں اور نفسیاتی گمراہیاں ادب کی وساطت سے پیش کرتے ہیں۔

ان کی شہرت اپنے مال کی خوبی پر نہیں بلکہ گاہک کی کمزوری پر ہے۔ اب بھی اس دور ہی کے لوگ انشا وبیان کے شہسوار ہیں۔ جس دور کے بہت سے چراغ بجھ چکے ہیں۔ یا پھر جن کے شباب نے ان کے بڑھاپے میں آنکھیں کھولی ہیں۔ مثلاً رشید احمد صدیقی اپنے قلم سے خطابت کے لیے مروارید تیار کرتے ہیں۔ ان کی ہر تحریر کے بہت سے فقرے، خطابت میں علو پیدا کرتے اور کسی نہ کسی موضوع کا طغریٰ ہوتے ہیں۔ پروفیسر آلِ احمد سرور کے اسلوب نگارش میں چشم سرگیں کی رعنائیاں ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ پنجاب میں علمی ذہانت اور ادبی وجاہت کا آخری سنگم ہیں۔ ادھر دہلی کی زُبان جو قلعہ معلےٰ کا سہاگ تھا، بعض اہل قلم کے ساتھ رخصت ہو چکی ہے۔ لیکن اشرف

صبوحی نے ایک صدی پہلے کی اس زبان کو اس طرح محفوظ کیا ہے کہ آدمی اس کے سحر میں ڈوب جاتا اور حیرت ہوتی ہے کہ ہم نے یہ شستہ زبان کہاں کھو دی ہے۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اردو کو یہ فخر بخشا ہے کہ اس میں علمی مسائل پر غیر زبانوں سے آنکھیں چار کی جاسکتی ہیں۔ مولانا کے اسلوبِ نگارش میں کوئی سی گنجلک نہیں۔ جس طرح پانی بہتا ہے اس طرح ان کے قلم سے الفاظ نکلتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں تقریروں کا جلال اور تقریروں میں تحریروں کا جمال ہوتا ہے۔ ان کے قلم نے الفاظ و معانی کے خزانے جمع کیے ہیں۔ کوئی لفظ بے معنی نہیں اور کوئی معنی بے ضرورت نہیں۔ مولانا نے عصری مسائل پر قلم اٹھا کر اردو کا دامن اس طرح بھر دیا ہے کہ نئی پود کے خطبا دین و سیاست کے عنوانوں میں اپنی تشنگیاں مٹا سکتے ہیں۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی ہندوستان کے حجازی خطیب ہیں۔ انہیں عربی میں قلم و زبان کی شہسواری حاصل ہے۔ خود عرب ادیب و خطیب اُن پر رشک کرتے ہیں۔ بعض اسلامی و عربی مسائل پر ان کی تجزیاتی کتابیں اور مختلف عصری و سیاسی مسائل پر ان کی تقریریں ادب و خطابت کا سرمایۂ عظیم ہیں۔ اور ان سے کئی چیزیں حاصل ہوتی ہیں۔ مثلاً اظہار کا طریق، اسلوب کا رنگ، الفاظ کا استعمال، معانی کا جماؤ، سلاست کا نکھار، متانت کی چاشنی اور ایجاز و اختصار کی رونق، کسی تحریر و تقریر کی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے سامع اور قاری کے لیے بوجھل نہ ہو اور کسی موڑ یا مرحلہ میں دماغ تھکاوٹ محسوس نہ کرے۔ بلکہ محسوس ہو کہ وہ اس میں ڈوب چکا ہے۔ مولانا ابوالحسن ندوی اپنے قاری کو اپنے ساتھ لے کر چلتے اور جب تک زیرِ مطالعہ کتاب ختم نہ ہو، اس کی کیفیت ذہن پر طاری رہتی ہے۔

ایک چیز فن خطابت پر مختلف کتابوں کے مصنفوں نے عموماً لکھی ہے کہ زبان سیکھنے کے لیے ناول، افسانے اور داستانیں ضرور پڑھی جائیں۔ اس سے زبان سیکھنے میں مدد ملتی، اظہار کے ڈھنگ معلوم ہوتے اور خصائص خطابت کے بعض رشتے ہاتھ آتے

ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ بعض عمدہ ناولوں، خوب افسانوں اور دلچسپ داستانوں سے اظہار و اسلوب اور زبان و بیان میں رونق پیدا ہوتی ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ بعض داستانیں، افسانے اور ناول فکر انگیز ہوتے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے ذہن میں ایک تحریک سی پیدا ہوتی ہے لیکن اردو ناول نویسی، افسانہ نگاری اور داستان گوئی کا معیاری سرمایہ انتہائی مختصر ہے۔ البتہ انگریزی ادب اور اس کے مختلف ترجمے اس سلسلہ میں کسی حد تک ضرور معاون ہوتے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے زبان و بیان اور اظہار و اسلوب کے علاوہ مطائبات و تمثیلات کی راہیں کھلتی ہیں۔

شاعری (نظم آزاد و نظم معریٰ سے قطع نظر) کا مطالعہ ہر خطیب و مقرر کے لیے اتنا ہی ضروری ہے جیسا صحت کے لیے صبح کی سیر یا رات کے بعد صبح کا اُجالا۔ اسی غرض سے شاعری کی ہر صنف کا مطالعہ ضروری ہے۔ حمد و نعت، غزل و نظم، قصیدہ و مرثیہ، مسدس و مخمس ہجو و ہزل کے مطالعہ، ذوق اور خط سے کئی چیزیں حاصل ہوتی ہیں۔ مثلاً تلفظ کی صحت، الفاظ کا استعمال، مطالب کا عمق، فقروں کی آرائش، لہجہ کی رونق، بیان کی رنگینی، احساس کی گہرائی، تخیل کا علو اور ذہنوں پر فتح مندی کا سلیقہ، ایک برجستہ شعر یا چند برجستہ اشعار کئی دفعہ پوری تقریر پر غالب آجاتے ہیں اور مجمع کے ذہنوں پہ نقش ہو کر دلوں میں تلاطم پیدا کرتے ہیں۔ مولانا ابو الکلام آزادؔ، مولانا محمد علی جوہرؔ اور سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے برجستہ شعروں سے اکثر مجمع پر سحر کیا اور ان کے دلوں کو جیتا لیکن وہ ارادۃً شعر استعمال نہیں کرتے تھے۔ ان کی تقریر کے کسی موڑ پر مضمون کی رعایت سے کوئی شعر بالبداہت زبان پر آجاتا اور مجمع لوٹ پوٹ ہو جاتا لیکن تقریر میں ارادتاً اشعار کا سہارا لینا اور تسلسل کے ساتھ اشعار پڑھنا، عوام کالانعام کی طبیعتوں کو متحرک ضرور کرتا ہے۔ مگر ایسی تقریر نہ تو مثبت جذبہ پیدا کرتی ہے اور نہ مستقل اثر چھوڑتی ہے۔ جن مقرروں کا انحصار شاعری پر ہو، وہ شب برأت کے پٹاخوں اور پھلجھڑیوں کی طرح مصنوعی بہار دکھا کر بجھ جاتے ہیں۔ میں نے اپنی خطابت کے ایک

دور میں شاعری پر انحصار کیا۔ عوام سے داد بھی خوب پائی لیکن پھر مطالعہ کی وارائی، تجربہ کی پہنائی اور مشاہدہ کی گہرائی کے باعث شاعری کا سوء استعمال رُک گیا۔ ایک چیز جو شاعری کے شغف سے ہر خطیب اور ہر مقرر حاصل کر سکتا ہے وہ خصائص خطابت کی بو قلمونی ہے۔ مَیں نے شاعری کے ذوق سے خطابت کے خصائص کا نصف حاصل کیا۔ ایک چیز ہے اسلوب اور ہر فن کسی نہ کسی اسلوب سے ہے۔ خطابت محض اسلوب نہیں لیکن اسلوب کا چہرہ نما ضرور ہے، اور یہ اس وقت تک صاف نہیں ہوتا جب تک خطیب و مقرر مطالعہ و مشاہدہ و تجربہ کی سہ گونہ وادیاں قطع نہ کریں۔ بعض لوگ اسلوب کے دلدادہ ہوتے اور مطالعہ و مشاہدہ و تجربہ کے بغیر اس کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں لیکن وہ کوئی سا اسلوب پیدا نہیں کر سکتے۔ اسی طرح کچھ لوگ، الفاظ کے زور میں ایک اسلوب بنا لیتے ہیں لیکن ایسا اسلوب زیادہ دیر نبھتا نہیں۔ اس کی مثال ہوائی غباروں کی سی ہے یا ایسی نیام کی جو مرصع ہو لیکن تلوار سے خالی، اس قسم کے مقرر الفاظ کے شعبدہ باز ہوتے اور تماشائی دماغوں کے لیے طربیہ رچاتے ہیں۔

شاعر، مصوّر، سنگتراش، انشا پرداز عوام کے روبرو نہیں آتے اور نہ ان کا فن شخصی حاضری کا مقتضی ہے لیکن ایک خطیب کی پہلی چیز شخصی حاضری ہے۔ وہ خود حاضر نہ ہو تو خطابت کا سوال ہی نہیں۔ خطابت اس کی حاضری، عوام کی موجودگی اور مضمون کے ابلاغ کا نام ہے۔ ایک خطیب کی شخصیت اس کے بیان کا ہالہ ہوتی ہے۔ دوسرے تمام فنون کا اظہار صرف پیشکش سے ہوتا ہے۔ اس کے لیے فن کار کی حاضری کا سوال ہی نہیں۔ اس کا فن ہی سب کچھ ہے۔ لیکن خطابت ایک ایسا فن ہے کہ اس میں خطیب کی بات کے ساتھ اس کی ذات بھی حاضر ہوتی ہے اور ان دونوں کے مشترکہ تاثر کا نام خطابت ہے۔ ایک کو دوسرے سے قطع نہیں کیا جا سکتا اور نہ الگ کر کے کسی تاثر کا پیدا ہونا ممکن ہے۔

ڈیماستھیز کا مقولہ ہے کہ خطابت الفاظ کی جادوگری ہے لیکن ایسے الفاظ جو معانی

سے محروم ہوں یا ان کی شریانوں میں مقصد کا لہو نہ دوڑ رہا ہو تو ان کی مثال خالی پیانوں کی سی ہے۔ اس طرز کے خطیب آتشباز کے مانند ہیں جو انار چھوڑتا اور مہتابیاں چلاتا ہے۔ ایک زمانہ میں انگلستان کے وزیر اعظم لارڈ بائرن نے کہا تھا:

"میں بچپن میں خوشنما لفظوں اور دلفریب جملوں کا شیدائی تھا۔ لیکن اٹھارہ برس کی عمر میں فرائیڈ کا یہ قول پڑھا کہ فنِ خطابت علمی بدکاری ہے۔ تو مرا عشق نفرت سے بدل گیا اور فصاحت و بلاغت سے مرا اعتقاد اٹھ گیا۔ علم ہمیں فصاحت و بلاغت سے بدظن کرتا ہے جو لوگ محض لسان یا الفاظ ہوتے ہیں، وہ گمراہی کو خوشنما پیش کرتے ہیں"۔

بائرن کے الفاظِ بالا، تمام حجت نہیں۔ ان میں تصویر کے دونوں رُخ ہیں۔ تاہم یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ الفاظ کی میناکاری اور فقروں کی گلباری دلوں کو اچھالتی ضرور ہے لیکن دماغوں کو اُجالتی نہیں۔ اور نہ کوئی اثباتی تصور پیدا ہوتا ہے۔ الفاظ بہر حال خیالات کا لباس ہیں اور یہ چیز خطابت کا حُسن ہے کہ ہم اپنے خیالات کس لباس میں پیش کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ فصاحت و بلاغت بہترین لباس ہیں۔ بلاغت کے لغوی معنی پہنچنے کے ہیں۔ یونانی علما کے نزدیک خیال اور دلیل کی وضاحت کامل کا نام بلاغت ہے۔ کسریٰ کا قول ہے کہ الفاظ کم اور معانی زیادہ بلاغت ہیں۔ ایک عربی مصنف کے نزدیک بلاغت اس کلام کو کہتے ہیں جو مختصر ہو، جامع ہو، دلکش ہو اور گنجلک سے بری ہو۔ جاحظ نے بیان کی تعریف میں بلاغت کے متعلق کہا تھا کہ الفاظ و معنی ساتھ ساتھ چلیں۔ ابن المعتز کے نزدیک بیان دل کا ترجمان اور عقل کی صیقل ہے۔ اس بارے میں کوئی شک ہی نہیں کہ خوشنما الفاظ فصاحت و بلاغت کے سانچہ میں ڈھل کر سامعین کے لیے سحر پیدا کرتے ہیں۔ جن مطالب و مقاصد کے لیے روکھے پھیکے الفاظ استعمال کیے جائیں وہ کبھی صحیح تاثر پیدا نہیں کرتے اور نہ گوشِ شنوا کو اپنی طرف کھینچنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ جس اسلوب میں فصاحت و بلاغت نہیں وہ اسلوب ہی

نہیں۔ مختصر یہ کہ فصاحت آرائش ہے۔ بلاغت زیبائش خطابت کی مثال پانی نہیں کہ بہ قول غالبؔ ساغرِ جم پر جامِ سفال کو ترجیح دی جائے کہ اور لے آئیں گے بازار سے گر ٹوٹ گیا۔ پانی بہر حال پانی ہے، مقصود پینا ہو تو مٹی کے آبخورے میں بھی پی سکتے ہیں۔ اور چاندی کے کٹورے میں بھی۔ خطابت جوان ہو تو خوبصورت ہے ورنہ اس کا لڑکپن یا بڑھاپا کسی التفات کا اہل نہیں۔ جو لوگ الفاظ کی دلفریبی اور فقروں کی دل نشینی پر اعتراض کرتے یا فصاحت و بلاغت کو غیر ضروری خیال کرتے ہیں وہ نہیں جانتے کہ ہر زبان کا ایک مزاج ہے اور کوئی زبان اپنے مزاج سے دستبردار ہو کر نہ تو اپنا حُسن قائم رکھ سکتی ہے اور نہ عوام کی دلفریبی کا باعث ہو سکتی ہے۔

ہم اُردو کے ان خطبا سے اس کا جواز معلوم کر سکتے ہیں جو خطابت کے شہسوار رہے ہیں۔ کہ ان کی ہمہ گیری کا راز کیا تھا۔ مولانا ابو الکلام آزادؔ، مولانا محمد علی جوہرؔ، سیّد عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، مولانا ظفر علی خاں اور اس سلسلے کے دوسرے لوگ اپنی فصاحت و بلاغت کی بدولت ہی شہرت عام اور بقائے دوام کے دربار میں داخل ہوئے تھے، ان کے فصیح و بلیغ فقرے آج تک لوگوں کے نوکِ زبان ہیں۔ اور کئی مقررین ان کے لقموں اور نوالوں سے اپنے خوانِ خطابت کی رونق بڑھاتے ہیں۔ وہ تمام مقررین جو مطالب کی خاطر الفاظ سے بے نیاز ہیں یا جنھوں نے الفاظ کو مطالب پر ترجیح دی، اُن کا چراغ ہی گُل ہو گیا اور وہ ایک سہ تاری پتنگ کی طرح فضا میں اڑ کے کٹ گئے۔

جس پائے کے خطیب عربی زبان نے پیدا کیے اُن کی تاریخ عالم آشکار ہے۔ خطبا کا جوہر تھا کہ ادھر ان کی زبان سے الفاظ نکلتے ادھر رستا خیز کی فضا پیدا ہو جاتی، نیام سے تلواریں نکل آتیں، گھوڑوں کی ٹاپیں گونجتیں، اور کشتوں کے پشتے لگ جاتے۔ آخر یہ کیا تھا؟ الفاظ کی شہ زوری، خطابت کی للکار اور رجز کی پکار، اسی حُسن ہی نے عربی کو جامع الکلمات بنایا۔ یہی چیز فارسی کی دل آویزیوں کا باعث ہوئی۔ اسی نے چمنستان اُردو کو سدا بہار کیا۔ اسی کا سحر تھا کہ سیاسی اجتماع اور قومی ہجوم تحریکوں کے میدان میں معرکہ آرا

ہوئے۔ ہم نے جو کچھ حاصل کیا وہ اُردو کی فتوحات میں سے ہے۔ ایک خطیب کے لیے دماغ، دل اور زُبان کے اعتبار سے سچا ہونا ضروری ہے۔ ان کی سچائی ہی سے خطابت کی فتح مندیاں حاصل ہوتی ہیں۔ سب سے پہلی چیز جس سے ایک مقرر شروع ہوتا پھر اس کی معرفت عوام کو ہاتھ میں لیتا ہے، وہ سٹیج ہے، اس سے گزرنا خطابت کا پہلا امتحان ہے۔ اس کی بحث تو ایک مستقل باب میں ہوگی لیکن سٹیج کا خوف، ایک ایسی چیز ہے کہ ابتدا ہر مقرر کو اس سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہی ایک جگہ ہے جہاں بڑے بڑے عالموں اور بڑے بڑے دانشوروں کے خیالات کی سٹی گم ہو جاتی اور ان کے خیالات کی روانی میں گرہیں پڑ جاتی ہیں۔ اس خوف پر فتح پا کر ہی خطابت کی نیو رکھی جا سکتی ہے۔ ادھر یہ جان لینا ضروری ہے کہ دنیا کا بڑے سے بڑا خطیب اس کا راز سے نکلا ہے اور اُس کے حواس کو سٹیج نے ضرور متاثر کیا ہے۔ یہ ایک نفسیاتی چیز ہے جو بسرعت پیدا ہوتی اور بعجلت ختم ہو جاتی ہے۔ وہ لوازم و خصائص جن سے خطابت ترکیب پاتی ہے۔ اس کتاب کے شروع میں خطابت کا چارٹ کے زیرِ عنوان درج ہیں اور حسبِ ذیل ہیں:

1) **آواز:** خطابت کی رفتار ہے۔ بول لینا اور بات ہے لیکن خطاب کرنا دوسری بات، اس غرض سے آواز کا صاف ستھرا ہونا، اس میں اتار چڑھاؤ ہونا اور مضمون کی رعایت سے نرم گرم ہونا، خطابت کا لازمہ ہیں۔ ایک مقرر میں صوتی حُسن جس خوبی سے ہوگا، اس کی فنی چابکدستی بڑھے گی۔ آواز کو ترتیب دینا زبان کی معرفت حاصل کرنے سے کم نہیں۔ خطیب و موسیقار کی آواز میں فرق یہ ہے کہ موسیقار الاپتا ہے اور خطیب بولتا ہے جس طرح ایک شاعر ترنم سے پڑھتا ہے، دوسرا تحت اللفظ۔ جو تحت اللفظ پڑھتا ہے اس نے اپنی آواز ڈھالی ہوتی ہے۔ یا اُس کی آواز ڈھلی ہوتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرتب آواز ہمارے سامنے ہے۔

2) **اظہار:** ایک چیز ہے آواز، دوسری چیز ہے اظہار۔ یعنی جو چیز کہتا ہے وہ کیونکر

بیان کی جائے۔ ہر موضوع کے لیے طریقِ اظہار مختلف ہوتا ہے حتیٰ کہ پبلک جلسوں میں بھی ہم موضوع کی رعایت سے طریقِ اظہار بدلتے ہیں۔ مثلاً فتح و شکست یا خوشی و غم کے جلسوں میں اظہار مختلف ہوگا نہ صرف لب و لہجہ میں فرق ہوگا بلکہ آواز کے اتار چڑھاؤ میں تفاوت ہوگی۔ ظاہر ہے کہ تعزیت کے جلسہ میں مسرت کا لہجہ اختیار نہیں کر سکتے۔ اسی طرح عوام کے اجتماع اور خواص کی تقریب میں بھی اظہار کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ مقرر کا لہجہ اظہار کی رُوح ہے اور تلفظ کی صحت اتنی ضروری ہے جتنا آنکھ کے لیے بینائی اور کان کے لیے سمع!

3) تکنیک: ہم کیونکر تقریر کرتے ہیں، ہمارے لب و لہجہ کا رنگ ڈھنگ کیا ہے؟ ابلاغ و اظہار کا سانچہ کیسا ہے؟ اور الفاظ و معانی کی چال ڈھال کیا ہے؟ یہی ہر خطیب کی تکنیک ہے۔ تمام مقرر اپنی تکنیک ہی کی معرفت عوام پر اثر ڈھالتے ہیں اور تکنیک ہی کی بدولت ان کے سحر و تاثیر کا تناسب ہوتا ہے۔ ایک دستر خوان کیونکر بچھایا جا سکتا اور اس پر مختلف پکوان کیونکر لگائے جا سکتے ہیں۔ یہ طعام کی تکنیک ہے۔ اس سے کلام کی تکنیک مشابہ ہے کہ جو کہنا ہے وہ کیسے کہا جائے اور اس کی ترتیب کیا ہو؟

4) اسلوب: اس خصوصیت کا نام ہے جو مقرر و خطیب اپنے لیے خاص کر لیتے یا ان کے لیے خاصی ہو جس طرح مختلف اشعار کی پہچان سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ فلاں شاعر کا ہے یا فلاح شاعر کے انداز میں ہے۔ اسی طرح ہر خطیب کا ایک اسلوب ہے۔ اسلوب کے معنی، زُبان و بیان کی طرز و روش کے ہیں۔

5) سلاست: معنی ہیں زُبان کی روانی، ایک مربوط آہنگ میں، کسی اٹکاؤ کے بغیر اس طرح بولنا کہ دل پر دستک پڑتی رہے اور کان محسوس کریں کہ اپنا دامن بھر رہے ہیں۔ فی الجملہ سلاست، صبا کی موج ہے، جو الفاظ کے غنچے چٹکاتی اور معانی کے پھول کھلاتی ہے، سلاست ہی میں نرم، آسان اور ہموار خطابت کے جوہر ہیں۔

اسی طرح حاضر جوابی، حاضر کلامی، برجستہ گوئی اور دوٹوک لہجہ سلاست کا جوہر ہیں۔ لیکن طوفانی لہجہ اور طغیانی اسلوب کسی حال میں بھی سلاست کا حصّہ نہیں۔ الفاظ کی بھرمار اور فقروں کی یلغار سے خطابت بھڑکتی یا بہہ جاتی ہے۔ خطابت زندگی کی طرح سلگتے رہنے کی نرم و گرم آنچ کا نام ہے۔ غالب کے الفاظ میں سلاست اس شعر کے مصداق ہے۔ ؎

دیکھیے تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ سمجھا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

فی الجملہ زبان کا وہ لٹکا جس سے طبیعت مسرور ہوتی ہے۔

6) **متانت:** جب تک مقرر اپنے موضوع یا مضمون سے سنجیدہ نہ ہو، اُس سے عوام کا متاثر ہونا ممکن نہیں۔ خطابت میں سنجیدگی، مشروب میں سرور کی طرح ہے۔ ایک غیر سنجیدہ تقریر مداری کا تماشا ہے۔ متانت خطابت کے چہرے کا سکون ہے۔

7) **اشارات:** ہر مقرر دورانِ تقریر اپنے ہاتھوں اور آنکھوں کے علاوہ چہرے کے اتار چڑھاؤ سے مختلف اشارات پیدا کرتا ہے۔ یہ اختیاری نہیں ہوتے بلکہ خیالات کے ساتھ بے اختیار ابھرتے اور آواز کے زیر و بم کی سفارت کرتے ہیں۔ ان کی حیثیت خطابت کے ساتھ وہی ہے جو نطق کے ساتھ ہونٹوں کی، زبان کے ساتھ بیان کی اور پاؤں کے ساتھ چال کی۔

8) **ظرافت:** ظرافت کے معنی ہیں خوش طبعی۔ عربی میں دانائی کو کہتے ہیں۔ بعض اہلِ قلم کی لسانی خوش معنیوں کے باعث ظرافت کے معنی ٹھٹھا اور تفنّن کے ہو گئے ہیں۔ کئی ایک کے نزدیک اس کے معنی بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی کے ہیں۔ اکثر ظرافت کے ڈانڈے فسی تخول، دل لگی، مذاق، تمسخر، طعن، طنز، پھکڑ، سب وشتم، الفاظ کی برہنگی اور مطالب کی عریانی سے ملاتے ہیں۔ حقیقتاً یہ ظرافت

نہیں۔ الفاظ کی فحاشی اور فقروں کی عیاشی ہے یا پھر خطابت کا ابتذال اور مذاق کی رکاکت ہے حقیقی ظرافت خندۂ ملیح ہے۔ اس کی مثال آٹے میں نمک کی ہے۔ جس طرح قہقہے اور تبسم میں فرق ہے۔ اس طرح ظرافت کے جمال اور ظرافت کے ابتذال میں تفاوت ہے۔ جو چیز ظرافت کا جمال ہے وہ مطائبات ہیں، جس سے طبیعت خوش گوار ہوتی اور سامعت کے چہرے پہ تبسم کھلتا ہے۔ اس کی صحیح تصویر یہ ہے کہ خطابت میں چٹکی لی جائے مطلب ہے لطیف و شریف طنز، ہلکا پھلکا مزاح، رواں دواں لطیفہ، چلتا پھرتا بذلہ، اور بولتی چالتی پھبتی اور پھبتی کے معنی ہیں اعلیٰ کو ادنیٰ سے تشبیہ دینا۔ ادنیٰ کے معنی گھٹیا ہونے کے ہیں۔ طنز یا پھبتی کا انداز یہ ہو کہ جس کے متعلق طنز کسی گئی ہے، وہ خود محسوس کرے کہ اس کو بھی لذت حاصل ہوئی ہے۔ کبھی کبھار خطابت کئی ایک جملوں میں بگٹٹ ہو جاتی اور ظرافت کی حدوں سے نکل آتی ہے۔ لیکن خطابت کے دوسرے خصائص اس طرح حاوی ہوتے ہیں کہ وہ قہقہوں میں محلول ہو جاتی ہے۔

9) **تمثیلات:** ان سے خطابت کا وزن سوا ہوتا اور زبان و بیان کو تقویت پہنچتی ہے۔ ان کی حیثیت تقریر میں وہی ہے، جو شاعری میں معاملہ بندی کی ہے۔

10) **استدلال:** خطابت کا ضمیر ہے، ظاہر ہے بلا استدلال ہر چیز مؤثر نہیں ہوتی بلکہ لمحۂ رواں کی طرح گزر جاتی ہے۔

11) **تجربہ:** اس سے خطابت جوان ہوتی ہے۔ اس سے مراد مشق ہے۔ ایک خطیب مجمع اور موضوع کے تسلسل ہی سے پختہ ہوتا اور مشاق کہلاتا ہے۔

12) **انفرادیت:** خطیب کی شخصی وجاہت اور خطابت کی معنوی چھب کا نام ہے۔ اس کی مثال ادا کے مانند ہے کہ وہ کیا ہے۔ کہہ نہیں سکتے کہ اس کا وجود نہیں۔ دیکھنے میں اس طرح انفرادیت کوئی متشکل شے نہیں اور نہ اسی کی تجسیم کی جا سکتی ہے۔

لیکن انفرادیت خطیب کے اظہار یہ ادا کا نام ہے۔

ان خصائص کے علاوہ خطابت کے بعض دوسرے لوازم بھی ہیں۔ مثلاً تیاری! یہ صحیح ہے کہ بعض تقریریں بلا تیاری کے بھی ہو جاتی ہیں۔ ان کا انحصار خطابت کے طویل تجربہ اور مطالعہ کی وسعت پر ہے۔ لیکن جامع تقریر کے لیے خطیب کا فرض ہے کہ اپنے موضوع و مضمون کی تیاری کرے۔ تیاری دو طرح کی ہے، ایک ذہنی کہ مطالعہ و فکر کے بعد، دماغ میں وہ چیزیں لف و نشر کے طور پر محفوظ کر لی جائیں جو عوام سے کہنی ہیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اپنے موضوع کے متعلق پرزہ کاغذ پر اشارات قلم بند کر لیے جائیں کہ اس ترتیب کے ساتھ فلاں فلاں بات کہنی ہے۔ تیاری کے بغیر تقریر کے خطوط مکمل نہیں ہوتے۔

ایک دوسری چیز یہ ہے کہ تقریر کی ابتدا کیونکر ہو کیونکہ خطابت کی ابتدا اس کا چہرہ نما ہے۔ چہرہ دلکش ہوگا تو کشش ہوگی۔ اس بارے میں مقررین کو اچھی طرح سوچ لینا چاہیے کہ خطاب کا ابتدائیہ عوام کو متحرک کرتا ہے۔ ابتدائیہ کی حیثیت بارات میں عقد کی طرح ہے۔ اس سے ایجابی تاثر پیدا ہوتا ہے اور تاثر کے معنی ہیں کہ آپ دوستوں کے التفات کو اپنی مٹھی میں کیونکر لے سکتے ہیں۔ ابتدائیہ کی طرح، اختتامیہ بھی دلفریب ہو تو خطابت کی چھاپ گہری ہو جاتی ہے۔ ایک عمارت کا آغاز کتنا ہی پرشکوہ ہو، لیکن اختتام تصدیق نہ کرے، شکوہ موثر نہیں ہوتا۔ بلکہ کوئی سا نقص، ساری عمارت کا عیب ہو جاتا ہے۔ اختتامیہ خطابت کا توشہ ہے۔ اس سے خطابت کی یکسانی کا احساس قائم رہتا اور اظہار میں کسی عنوان سے کوئی تشنگی محسوس نہیں ہوتی اور یہی چیز خطابت میں حُسن و کمال ہے۔

ایک خطیب کا بنیادی فن رنگا رنگ کے مجمع کی گوناگوں طبیعتوں کو اختلاف امزجہ کے علی الرغم وحدت مقصد میں ڈھالنا ہے۔ یہ کوئی معمولی چیز نہیں۔ گفتار کا معجزہ ہے کہ ہزاروں انسان ایک ہو جائیں۔ وہی خطیب کامیاب خطیب ہے جو اپنے سامعین کو

گوش بر آواز اکائی کی شکل دیتا ہے۔ جن نامور ہستیوں نے خطابت میں نام پیدا کیا، ان کا مطالعہ ایک نو آموز مقرر اور نووارد خطیب کو فنی کمال تک پہنچانے میں ضرور معاون ہوتا ہے۔ اس کے بغیر فن خطابت کی ترتیب ادھوری رہ جاتی ہے، جب تک دوسرے خطیبوں کو دیکھیں نہیں کہ وہ کیونکر بولتے ہیں اور دماغوں کو جیتنے کے لیے کس طرح الفاظ و معانی میں آہنگ پیدا کرتے ہیں۔ خطابت محض کتابوں کے مطالعہ سے حاصل نہیں ہوتی۔ اور نہ اس موضوع پر کوئی سی نئی کتاب استاد ہو سکتی ہے۔ اس بارے میں جتنا مطالعہ ضروری ہے، اتنا مشاہدہ لازم ہے۔ اور مشاہدہ دوسرے مقرروں اور خطیبوں کے سننے ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ اس مشاہدہ کے بعد ہی ہم تجربہ کر سکتے ہیں۔ خطابت کا معمل یہ ہے کہ خطیبوں کو مجمعوں میں دیکھیں کہ وہ کیونکر خطاب کرتے ہیں۔ اس مشاہداتی سبق کے بغیر بلکہ خطابت کا حصول ناممکن ہے۔ اب وہ لوگ نہیں رہے جو خطابت کے شہسوار اور اس اُفق کے مہر و ماہ تھے۔ وہ تمام اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں اب سیاسی عوامل اور سائنسی مظاہر نے فضا بدل دی ہے۔ ادھر تعلیمی سانچے اس آب و گِل کے ہو گئے ہیں کہ آزادی کے بعد وہ خطیب ہی پیدا نہیں ہو رہے جو برِّ عظیم کی جدوجہد آزادی کے مختلف دوائر میں سرمایۂ افتخار تھے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ آزادی کے بعد ہم نے ادب و مذہب اور تہذیب و سیاست کے کسی شعبہ میں کوئی بڑا آدمی یا نمائندہ شخصیت پیدا نہیں کی۔ ہم ایک عبوری دور سے گزر رہے ہیں۔ ہمارے سامنے تجربے ہی تجربے ہیں۔ اس کا سبب ہے کہ ہم مختلف میدانوں میں ماضی کی یادوں کے سہارے مستقبل کے تماشائی ہیں۔ اب خطابت کا ادارہ اس حد تک کمزور ہو گیا ہے کہ خطابت کا مزاج پلٹ چکا ہے جن کا رابطہ خطابت کے طلائی عہد (Golden Era) سے ہے وہ انگلیوں کی پوروں پر گنے جا سکتے ہیں۔ ان میں ابوالکلامؒ، مولانا محمد علی جوہرؔ، مولانا ظفر علی خان، سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اور بہادر یار جنگ کوئی نہیں۔ کچھ لوگ اس دور کے ہیں تو وہ آخر شب کا چراغ ہیں۔ اس خلا کا سبب ڈھکا چھپا نہیں۔ کئی ایک موانعات ہیں۔

مثلاً نئی پود عمرانی سانحوں اور معاشی حادثوں کا شکار ہے۔ علم گھٹ چکا ہے۔ تعلیم بڑھ گئی ہے۔ اور تعلیم کی اساس کسی عشق پر نہیں، معاش کا ذریعہ ہے۔ ہم جس زُبان سے مانوس تھے وہ دانشوروں کے ہتھے چڑھ کر لاغر ہو چکی ہے۔ اس کے علاوہ تعلیمی ارتداد نے خطابت کا عرفان کھو دیا ہے۔ نتیجتاً خطابت ایک بحرانی دور سے گزر رہی ہے۔ جس طرح عربی خطابت کا ماضی بعید عظیم الشان تھا، اسی طرح اُردو خطابت کا ماضیِ قریب فقید المثال ہے۔ اب دونوں ماضی کا تذکرہ ہیں اور اُن کا وجدانی تاج محل گردشِ زمانہ کے تھپیڑوں میں ہے۔

سٹیج

سٹیج ہر مقرر کی ابتدائی آزمائش ہے۔ ہر بڑا مقرر اس آزمائش سے نکلا ہے۔ اور ہر نئے مقرر کو پہلے پہل اس سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس سے مفر ہی نہیں گویا سٹیج سب سے بڑی روک ہے جو کسی مقرر کو شروع ہی میں پیش آتی ہے۔

ڈیما ستھینز کے نزدیک سٹیج کا خوف، حواس کی تپ ہے۔ سسرو کے نزدیک اعصاب کا رعشہ، چیتھم کے نزدیک سکوت کی اُترن، گلیڈ سٹون کے نزدیک خطابت کی زچگی، البتہ برک کے نزدیک یہ خوف کی کوئی چیز نہ تھا۔ اس سلسلہ میں اُردو خطبا سے معلومات حاصل نہ ہو سکیں اور نہ اس بارے میں اس کی کوئی تحریر ہے لیکن عمومی چیز یہی ہے کہ ہر مقرر کے حواس ابتدائی طور پر سٹیج سے متاثر ہوتے ہیں۔ اور وہ ایک غیبی خوف سے گھبراتا ہے۔ اس کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ اپنی ذات پر اُسے اعتماد نہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ عوام سے خوفزدہ ہے۔ لیکن یہ خوف دو تین صحبتوں ہی میں ختم ہو جاتا ہے۔ ہر چیز ابتدائی تجربے میں ہراس پیدا کرتی ہے۔ یہ کوئی سانحہ یا افتاد نہیں۔ ایک قدرتی اضطراب ہے اور ہر نیا تجربہ دماغ کو اس طرح کے تذبذب میں مبتلا کرتا ہے۔ سٹیج کا خوف بظاہر حواس کا اضطراب اور اعصاب کا تعطل ہے۔ لیکن اس کی پیدائش ایک ایسے خوف سے ہوتی ہے جو انسانوں کے جھرمٹ سے پیدا ہوتا اور خیالات میں ہلچل ڈالتا ہے۔ ایک ایسی کیفیت اُبھر آتی ہے کہ مقرر کا وجود سیمابی ہو جاتا، اس کی زبان لڑکھڑا جاتی اور اس کے افکار ذہن میں لٹک یا اٹک کے رہ جاتے ہیں۔ اس لمحہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کے حلق میں کوئی غیر مرئی ہاتھ ہے جو اس کے

الفاظ کو کھینچ رہا، اس کے فقروں کو سکیڑ رہا اور اس کی آواز کو تھرا رہا ہے۔ اگر مقرر پہلے خوبصورت ابتدائیہ تیار کرے اور عوام اس پر تحسین کریں تو سٹیج کا خوف ان فقروں اور نعروں کے ساتھ ہی ختم ہو جاتا اور مقرر احتساب کے غیر شعوری احساس سے نکل جاتا ہے۔ پھر یہ اندیشہ نہیں رہتا کہ الفاظ و معانی کی نبضیں ڈوب رہی ہیں، یا آواز، موج تہہ نشین ہو چکی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ سٹیج کا خوف کوئی خوف ہی نہیں کچھ ہے تو حواس کی لغزیدہ پائی ہے۔ مقرر غیر شعوری طور پر اس کا شکار ہوتا ہے کہ اس کے سامنے جو لوگ بیٹھے ہیں، وہ شاید نقاد یا محتسب ہیں۔ ان کی نگاہیں، ان کے تعاقب میں ہیں۔ اس ڈر سے کبھی اس کی آواز کانپتی، کبھی دانت بجتے، کبھی لہجہ پھسل جاتا ہے۔ حتیٰ کہ الفاظ گلے کی پھانس ہو جاتے اور خیالات چکنا چور ہونے لگتے ہیں۔ اس مرحلہ میں صوت اور سکوت میں آویزش ہوتی ہے۔ اِدھر آواز پر سکتہ طاری ہوتا اُدھر تلفظ کا سانس اکھڑ جاتا ہے۔ اسی خوف سے کئی اضحوکے پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً آواز بے ہنگم ہو جاتی ہے۔ واحد متکلم کی جگہ جمع متکلم اور تذکیر کی جگہ تانیث آجاتی ہے۔ تمام اجزائے دماغ بکھر جاتے ہیں۔ پاؤں ڈگمگاتے، بدن پہ کپکپی طاری ہوتی اور چہرے پہ ہوائیاں اڑنے لگتی ہیں۔ لیکن یہ دو ایک صحبتوں کی چیز ہے۔ ایک دفعہ اس پُل صراط سے ہر مقرر کو گزرنا پڑتا ہے۔ اس کے بعد سٹیج کا خوف ہی نہیں رہتا۔ پھر ایک مقرر کے لیے عوام اُس کی متاع ہیں۔ اور وہ ان سے سبھی کچھ حاصل کر سکتا ہے۔ ایک مقرر سٹیج کی گھبراہٹ پر قابو پا کر محسوس کرتا ہے کہ اُس کی زُبان کُھل گئی ہے اور اُس کا دماغ ہراس سے نکل چکا ہے اس مقام پر جو چیز ضروری ہے وہ عوام کی نفسیات سے آگاہی اور اپنے بیان کی طاقت کا احساس ہے۔ بعض مقرر عوام کی نفسیات سے اجتناب کرتے اور اپنے ہی خیالات کے ہو کے رہتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ان کے پاس کہنے کے لیے کچھ ہے۔ لہٰذا فضا کا احساس کیے بغیر کہے جاتے ہیں اور نہیں جانتے کہ سٹیج پر قابو پانے سے وہ عوام پر قابو نہیں پا سکتے۔ ایک مقرر

کو عوام کی ذہنی استعداد کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے طور پر یہ ضرور طے کر لینا چاہیے کہ وہ جس مجمع سے مخاطب ہے اُس کو کتنی دیر ساتھ لے کر چل سکتا ہے اور جس اجتماع کا مقرر ہے، اس کا وہی مقرر ہے یا دوسرے مقرر بھی ہیں۔ اور ان کا مقام کیا ہے۔ اکثر مقرر مجمع سے زیادہ اپنے خیالات کو عزیز رکھتے، عوام کی اکتاہٹ کو مطلقاً محسوس نہیں کرتے۔ داد کے روپ میں بیداد کا اندازہ نہیں کر پاتے اور کلماتِ ستائش کی منفی شکلوں کو بھانپ نہیں سکتے کہ ان پر تنقید و تعریض کے چھینٹے اڑائے جا رہے ہیں۔ مقرر کا فرض ہے کہ مجمع کا تیور شناس ہو۔ جب اجتماع کے مقصد کا اعلان کیا جا چکا ہے تو لازم ہے کہ عوام کی نگاہوں سے اپنے مضمون کا انتخاب کرے اور پہلی سوچ میں فیصلہ کر لے کہ جو لوگ اس کے سامنے بیٹھے ہیں، انہیں وہ کن الفاظ اور کس لہجہ سے اپنا سکتا ہے۔ ایک مقرر کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے کہ عوام کی خواہش کے خلاف بولے جانا بہت بڑی غلطی ہے۔ اس بے طلب خطابت ہی کا نتیجہ زبردست قہقہے اور تفریحی تالیاں ہوتا ہے۔ بہر حال یہ چیز واضح ہو گئی اور پہلے باب میں بھی اشاراتی طور پر آ چکی ہے کہ سٹیج کا خوف کوئی طویل یا دائمی چیز نہیں۔ جس طرح ایک بچہ اوّل اوّل کھڑا ہونے سے لرزتا ہے اسی طرح ایک مقرر پہلے پہل عوام کا سامنا کرنے سے گھبراتا ہے۔ اور اس کا علاج اعتمادِ ذات ہے کہ مقرر کو اپنی ذات پر کس قدر اعتماد ہے۔ آپ مجمع کے لیے کچھ لاتے ہیں اور وہ اُسے سونپنا چاہتے ہیں تو ابتدائی خوف موج ہوا کی طرح نکل جائے گا کیونکہ عوام تماشہ دیکھنے نہیں آتے، خود تماشہ ہو کر آتے ہیں۔ یہ بات ذہن میں رکھیے کہ جن لوگوں سے آپ مخاطب ہیں، ان سے آپ کچھ لے نہیں رہے بلکہ انہیں کچھ دے رہے ہیں اور اس غرض سے آپ کے روبرو انہوں نے سماعت کا کشکول بچھا رکھا ہے۔

وہ ذہنی طور پر بھوکے ہیں اور آپ انہیں فواکہات دے رہے ہیں۔ عوام جب ایک جلسہ کی شکل میں جمع ہوتے ہیں تو کچھ جانتے اور کچھ سننے کے لیے جمع ہوتے ہیں۔ خطیب کے فرائض بھی ہیں، اور حقوق بھی۔ فرائض میں سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ وہ

مجمع کو سب کچھ بتائے، جس کے لیے وہ جمع ہوتے ہیں اور حقوق یہ ہیں کہ مجمع مصدق ہو کہ جو کچھ کیا جارہا ہے وہ اس کے دماغ و دل کی تصویر ہے۔ جب یہ تصویر بنتی ہے تو مجمع تحسین کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ تہنیت کے نعرے، مقرر کے، اس خوف کو ختم کر دیتے ہیں جو سٹیج سے پیدا ہوتا اور کئی دفعہ ذہن کی لہروں کو لاحق رہتا ہے۔

بعض مقرروں میں شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ نقص ہوتا ہے کہ جس موضوع پر جلسہ ہو رہا ہے، وہ اس کے متعلق سبھی کچھ کہہ دینا چاہتے ہیں اور ساتھی مقرروں کے لیے شعوری یا غیر شعوری طور پر کچھ چھوڑنا نہیں چاہتے یا کچھ مقرر اپنے سے بہتر مقرروں کی موجودگی سے مرعوب ہو کر احساسِ کمتری کا شکار ہوتے ہیں۔ یہ دونوں چیزیں غلط ہیں۔ اپنی حدود میں رہیے، عوام کے لیے بار نہ بنیے۔ وہ دوسرے مقرروں کو بھی سننا چاہتے ہیں، جب ایک جلسہ میں کئی مقرر ہوں تو مجمع فردِ واحد کے لیے نہیں، سب کے لیے ہوتا ہے اور اُن سب کے نام پر اکٹھا ہوا ہے۔ اس حقیقت کو جھٹلانا درست نہیں، اسی باعث بسا اوقات مجمع میں رنگا رنگ آوازیں اُٹھنے لگتی ہیں اور سامعین ایک کی کاٹ پر دوسرے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ سب سے اچھا مقرر وہی ہے جو ایجاز و اختصار میں رعنائی و دلکشی قائم رکھے، عوام کے چہرے پر بیزاری کی شکن پیدا نہ ہونے دے اور وہ کسی موڑ پر تھکاوٹ کا شکار نہ ہو۔ سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ مجمع آپ کے ساتھ کب تک چلتا ہے؟ اور یہی ایک فن ہے جس سے خطابت کا سحر معلوم ہوتا اور اس کی تاثیر کے درجہ حرارت سے آگاہی ہوتی ہے۔ یہ چیز مشکل نہیں۔ ہر مقرر معلوم کر سکتا ہے کہ لوگ اس کی آواز سے کہاں تک پیوست ہیں اور اس کے اثرات اس کے دماغ و دل پر کیا ہیں۔ ایک مقرر کے لیے، عوام کی نگاہیں اور چہرے اور اس کا مقیاس ہوتے ہیں کہ وہ عوام میں کیا تاثر پیدا کر رہا ہے اور اس تاثر کی رفتار کیا ہے؟

واضح رہے کہ ہر فن شروع میں مشکل ہوتا ہے۔ ہم بچے تھے، ہم نے بیٹھنا سیکھا، چلنا سیکھا، بولنا سیکھا، پڑھنا سیکھا، کبھی ہمارے لیے حروفِ ابجد کو پہچاننا انتہائی مشکل

تھا۔ جتنا ہمارے لیے اسرارِ فطرت کے بعض گوشوں سے آگاہی حاصل کرنا اور مابعد الطبیعاتی حقائق سے آگاہ ہونا، یہ کھانا پینا اور پہننا ہمارا سیکھا ہوا ہے۔ ہر وہ چیز جو شعور کے بعد سادہ سہل اور آسان نظر آتی ہے ہماری سیکھی ہوئی ہے۔ اور ہم نے کس درجہ محنت سے سیکھی ہے۔ ہر تیراک پہلے ڈوبتا رہا اور ہر سوار پہلے گرتا رہا ہے۔ یہ نوشت و خواند، یہ بول چال یہ کہنا سننا، یہ بات چیت کیا ہیں؟ یہ سب سیکھی ہوئی ہیں۔ ان کی تحصیل کے لیے ہم کسی نہ کسی درجہ کی محنت و مشکل سے نکلے ہیں۔ یہی چیز پہلے پہل عوام سے مخاطبت میں پیش آتی ہے لیکن جونہی وہ خوف ٹل جاتا ہے تو ہم حواس کے ہراس سے نکل جاتے ہیں۔ پھر جیسے وہ کوئی چیز ہی نہ تھا۔ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ مجمع خیالات و احساسات کی رنگا رنگی کے باوجود خالی الذہن ہوتا ہے اور جاننا چاہتا ہے کہ آپ اس کے لیے کیا لائے ہیں۔ تاہم یہ نکتہ ہر مقرر کے ذہن میں رہنا چاہیے کہ مجمع جذبات کی مخلوق ہے۔ وہ خطابت کے معرکوں میں جذبات سے شکار ہوتا اور استدلال سے شاذ ہی فائدہ اٹھاتا ہے۔ جب سیاست میں تحریک کا زمانہ ہو تو مجمع کی مثال ایندھن کی سی ہے کہ ہم اس کو خطابت کے فیتے سے بھڑکا سکتے ہیں لیکن ایک مقرر کو یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے کہ مجمع، مطیع و معتقد بھی ہوتا ہے اور ناظر نقاد بھی!

مَیں خود ان تجربوں سے نکلا ہوں۔ اب سے 45 برس پہلے مَیں نے تقریر کی مشق شروع کی اور دو تین سال تک کہ مَیں اس وقت آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا، مجھ پر سٹیج کا خوف غالب تھا۔ مَیں دو فقرے نہیں بول سکتا تھا۔ چونکہ مَیں سکول کی بزمِ ادب کا سیکرٹری تھا اور مجھ میں گھریلو فضا کے باعث شرمیلا پن تھا، اس لیے اپنے ساتھیوں سے مخاطبت کا حوصلہ نہیں رکھتا تھا۔ لیکن جولائی 1935ء میں ایکا ایکی بند ٹوٹا اور مَیں پہلے ہی دن اپنے ادبی ذوق اور شعری میلان کے باعث لفاظ ہو گیا۔ مَیں نے لاہور کی شاہی مسجد میں ایک دھواں دھار تقریر کی جس میں جذبات کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس وقت عوام کو مقرر کی ضرورت تھی۔ وہ تمام راہنما جو شہید گنج کی تحریک میں شامل

تھے اور شعلہ بیان خطیب خیال کیے جاتے تھے، ایک ہی رات میں دُور دراز مقامات پر نظر بند کیے جاچکے تھے۔ اور جو اس تحریک سے الگ تھے، اپنی شعلہ نوائیوں کے باوجود معتوب ہو چکے تھے۔ عوام شہید گنج کے سلسلہ میں اپنے مشتعل جذبات سے بے قابو تھے اور ایک ولولہ چاہتے تھے۔ مَیں نے کہ میری مسیں بھی بھیگی تھیں اور مَیں تجربۃً خطابت کے مبادیات سے بھی ناواقف تھا، ایک دوست کی تحریک پر شاہی مسجد میں ایک جلسہ عام کی صدارت کی۔ مجھ سے پہلے دو یا تین نوجوانوں نے خطاب کیا۔ وہ میری ہی طرح نو آموز تھے اور شاید پہلی دفعہ خطاب کر رہے تھے۔ اُن کے الفاظ میں ترتیب کا آہنگ نہ تھا، ایک اُبال تھا۔ مَیں عمر میں چھوٹا تھا لیکن مرے ادبی ذوق نے مجھے سہارا دیا۔ مَیں نے اس دوران میں ابتدائی الفاظ حفظ کر لیے۔ دو چار نعروں کا سہارا لیا، کھڑا ہُوا تو اپنے اندر اوئی سا اضطراب محسوس کیا۔ اِدھر زُبان کھلی، اُدھر لوگوں کی داد و تحسین نے طبیعت کے بند کھول دیے ان کے نعرہ ہائے تکبیر نے رواں کیا۔ مَیں نے محسوس کیا ایک کتاب کُھل گئی ہے اور مَیں اس کے ورق الٹ کر پڑھ رہا ہوں۔ اس کے بعد مجھے کبھی سٹیج کا خوف محسوس نہ ہُوا۔ پہلے پہل کی پانچ چھ تقریروں میں، اور یہ 1935ء کا زمانہ تھا۔ مَیں نے پانچ چھ فقرے تحریر کیے اور حفظ کر لیے اور یہ میری اٹھان تھے۔ اس کے بعد مَیں نے کبھی ضرورت محسوس نہ کی۔ سالہا سال عوام کے دماغوں کی معیت میں نکل گئے۔ اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اس میدان میں یکہ تاز ہوگیا۔ اور مجمعوں کی فتح مندیاں شریک حال رہیں۔ لیکن اس میدان کے نواردوں کو 40 سالہ تجربے کی بنیاد پر کہہ رہا ہوں کہ اپنی مشقوں میں تقریر کے ابتدائی فقرے کہہ کر حفظ کریں اور ذہنی تیاری سے آخر تک نہ چُوکیں۔ ہر اور ہر خطاب میں تیاری ملحوظ و مقدم رکھیں کہ ایک زور دار ابتدائیہ ہی مقرروں کے لیے انشراحِ صدر کا باعث ہوتا ہے۔ اس کی مثال گھڑی کو چابی دے کر رواں کرنے کی ہے لیکن تقریر کا رٹنا درست نہیں۔ جو لوگ تقریر رٹتے ہیں وہ کامیاب نہیں ہوتے۔ اپنی

ابتدائی مشقوں میں چند کلمات حفظ کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ آپ اس کو عادت بنا لیں۔ یہی چیز بعض حالتوں میں نقص بن جاتی ہے۔ جب مشق ہو چکتی ہے تو پھر دوسرے مقرروں کے خیالات سے ابتدائی کلمات بداہۃً زبان پر آجاتے ہیں۔ ایک خطیب ہدایت وار تحال ہی سے چمکتا ہے۔ خطابت میں حاضر دماغی، برجستہ گوئی اور خیالات کی شتابی اس کے سونے کا سہاگہ ہیں۔ ایک شیوہ بیان مقرر، اپنے اظہار و اسلوب کے زیر و بم کا انتخاب سامعین کی نگاہوں سے کرتا ہے۔ کسی مجمع کو ملتفت کرنا چنداں مشکل نہیں۔ وہ گھر ہی سے ملتفت ہو کر آتا ہے بشرطیکہ مقرر جانتا ہو کہ مجمع کیا چاہتا ہے۔ ہر مجمع کی ایک نبض ہوتی ہے۔ اگر مقرر نباض ہے، اناڑی نہیں تو وہ مجمع کی نبض کو مٹھی میں لے کر مسیحا بن سکتا ہے۔ ہر مجمع میں خود سپردگی کے انداز ہوتے ہیں۔ کسی مجمع کو اپنے خیال کی وحدت میں ڈھالنا، ہزاروں کو ایک کر دینا اور ان کے کانوں سے ان کے دلوں میں اُتر جانا فی الواقعہ معجزہ ہے۔ اس صورت میں طلاقتِ لسانی ایک سیل ہے جس میں عوام بہہ جاتے ہیں۔ عوام کو یقین ہو کہ آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں، انہی کے لیے کہہ رہے ہیں اور اخلاص سے کہہ رہے ہیں تو آپ پر بچھ جاتے ہیں۔ وہ پاؤں کے آبلوں سے خارِ مغیلاں کی تواضع کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ آپ کا ہر لفظ اُن کے دل کی دھڑکن ہے اور آپ ایک ذہنی کارواں کے حدی خواں ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک چیز زبان و بیان سے متعلق مقرر کی انا (Ego) ہے۔ اگر وہ معذرت کا لب و لہجہ اختیار کرتا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اپنے بارے میں تذبذب کا شکار ہے اور جب مقرر تذبذب کا شکار ہو تو وہ اپنے ساتھ انصاف نہیں کرتا۔ اس کا مجمع سے کسی تحسین یا انصاف کی توقع رکھنا واہمہ ہے۔ ایک اچھا مقرر اپنی استعداد کے بارے میں کبھی انکسار نہیں کرتا۔ کسی خیال سے متعلق کبھی معافی نہیں چاہتا۔ کسی عنوان سے کسر نفسی کا شکار نہیں ہوتا اور نہ اپنے جوہر کو منحنی الفاظ سے پسپا کرتا ہے۔ وہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے پورے اعتماد سے کہتا اور استغنا و استقامت کے لہجہ میں جماؤ سے

بولتا ہے۔ اس قسم کے فقرے: "حضرات مَیں زیادہ وقت نہیں لوں گا" ...... "چند کلمات سماعت فرمایئے" ...... "مجھے اپنی کوتاہ فکری کا احساس ہے" ...... "میری غلطیوں سے چشم پوشی کیجیے" ...... کسی خوبی کا اظہار نہیں۔ بلکہ کمزوری کا اقرار ہے۔ آپ اس لیے تقریر نہ کریں کہ آپ بولنا چاہتے ہیں یا آپ کو تقریر کا شوق ہے۔ آپ اسی لیے تقریر کریں کہ لوگ اس کو سننا چاہتے ہیں اور آپ کی تقریر کو مجمع کی ضرورت ہے۔ آپ خصائص خطابت پر قابو پا چکے ہیں۔ آپ کو ان کا ملکہ حاصل ہے۔ آپ کی آواز عطیۂ الٰہی ہے۔ آپ کا فن انعام ایزدی ہے۔ آپ لوگوں سے اس لیے خطاب کریں کہ آپ کو یہ خوبی اسی لیے عطا ہوئی ہے۔ اس قسم کے تحائف نجی ملکیت نہیں ہوتے بلکہ فردِ واحد کو مبداء فیاض سے اس لیے عطا ہوتے ہیں کہ وہ ان سے مخلوقِ خدا کی خدمت کرے اور یہ چیز ذہن میں رکھیے کہ معذرت غلطیوں پر کی جاتی ہے، افکار پر نہیں۔ آپ عوام سے جو ابھی کہنا چاہتے ہیں، اس پر اعتذار کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اس کہنے سے نہ کہنا بہتر ہے۔ آپ سٹیج پر ہیں تو سب سے بڑا سوال آواز ہے کہ آپ، اس پر قادر ہوں۔ آپ کو معلوم ہُوا کہ اس کے اتار چڑھاؤ کے مقام کیا ہیں؟ اور یہ تجربہ مختلف مقرروں کی تقریریں سننے سے حاصل ہوتا ہے۔ کہ الفاظ کا زیر و بم کیا ہے؟ کس خیال کے ساتھ کون سا لفظ کس رنگ اور ترنگ سے بولا جاتا ہے۔ بعض لوگ اس خیال سے گلا پھاڑتے ہیں کہ شاید تقریر کا لہجہ یہی ہو۔ بعض گونج اور گرج کو زبان و بیان کا پنچم سمجھتے ہیں حالانکہ ان میں سے کوئی بھی تقریر نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ تقریر میں گونج اور گرج سے کام لیا جاتا ہے لیکن ان کے موثر پیرا مرحلہ میں خطابت کی اصل زبان سلاست میں ملائمت ہے لیکن ملائمت سے مراد خنکی یا آہستگی نہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں مٹھاس سے کہہ رہے ہیں۔ وہ شور و غل نہیں۔ آواز کا مدوجزر ہے۔ آپ عوام کا ذہنی قرض اتار رہے ہیں یا ان کے نگار خانۂ خیال میں چراغ جلا رہے ہیں۔

تمام الفاظ اپنا ایک مزاج رکھتے ہیں۔ ان کا لہجہ، اُن کے مطالب کے ساتھ بدلتا ہے۔ الفاظ کو نہ تو حنظل کی طرح اُگلیے اور نہ چنوں کی طرح چبایئے۔ ان کے ساتھ وہی سلوک کیجیے جو مصوّر اپنے رنگوں کے ساتھ اور مغنی اپنی دُھنوں کے ساتھ کرتا ہے۔ آپ الفاظ کے استعمال کی بو قلمونیوں سے ادیبوں، شاعروں، عالموں، دانشوروں، مفکروں، مغنیوں اور مقرروں کی صحبت ہی میں مستفید ہو سکتے ہیں اور ان کی ہر نشست ہی میں اپنے تلفظ کی نگرانی کر سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک تواتر کے ساتھ سیکھنے اور جاننے کی ضرورت ہے۔ جو اوصاف وہبی طور پر عطا ہوتے ہیں، ان کے لیے بھی اکتسابی فضا میں ریاض کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو لوگ قدرت کے انعام یافتہ ہوتے ہیں۔ مثلاً عبقری و نابغہ، وہ ان تھک تنہائیوں میں علم سے بہرہ مند ہو کر نمایاں ہوتے ہیں اور عوام کی نگاہوں کا مرجع بنتے ہیں۔ دنیا نے کبھی ان لمحوں کا نوٹس نہیں لیا۔ جب ایک نابغہ یا عبقری اپنے شب و روز، علم و نظر اور غور و فکر کی صحبت میں گزار رہا تھا لیکن جب وہی لمحے حاصل زندگی ہو گئے تو ایک دنیا کی نگاہیں اٹھ گئیں۔ آپ مدرسہ میں تھے تو والدین کی نگاہ آپ کی نگران تھی۔ مطالعہ کی تنہائی میں تھے، تو آپ کا ذوق نگران رہا۔ پھر جب اس خلوت سے باہر آ گئے اور نتائج کے بازار میں قدم رکھا تو آپ کا مطالعہ عوام کے لیے کشش کا باعث ہو گیا اور اس کے برگ و بار سب کے لیے ہو گئے۔ بالآخر آپ کا وجود ایک فرد سے ایک شخصیت ہو گیا۔

اس صحبت کا خلاصہ یہ ہے کہ سٹیج آپ کی منزل نہیں، ایک پڑاؤ ہے۔ آپ نے سستا کر اس کو سر کیا اور خود اعتمادی کی عنان ڈال کر شہسوار ہوئے ہیں۔ غرض یہ ایک ایسی کھائی ہے جو ایک ہی جست میں پھلانگی جا سکتی اور اس کے ہراس سے حواس کو بچایا جا سکتا ہے۔

سلاست

سلاست معناً نصف خطابت ہے۔ اس کے معنی نہ تو الفاظ کی بوچھاڑ کے ہیں اور نہ صوتی گونج گرج کے، خطابت کے خصائص میں سلاست کی اجمالی شرح آچکی ہے۔ معنی میں روانیِ زبان، لیکن روانی کے معنی نہ تو لب ولہجہ کی سیلابی وطغیانی کیفیت کے ہیں اور نہ صوتی آبشار یا آواز کی تیغ رانی کے۔ اس کا مطلب ہے کہ جو کچھ کہنا ہے بغیر کسی اٹکاؤ کے کہیں اور الفاظ اس طرح ایک دوسرے سے پیوست ہو کر نکلیں جس طرح جوڑے کی گند حاوث ہو۔ پھر عروسی جوڑا گوٹا کناری کی تزئین سے مرصّع ہوتا ہے جس طرح ایک متناسب الاعضا جسم کا ٹانکہ ٹانکہ بولتا ہے۔ اسی طرح سلاست کے باعث ایک جامع تقریر اس طرح کھلتی چلی جاتی ہے کہ اس کے جملے دل میں ترازو ہو کر رہ جاتے ہیں۔ خطابت کی مثال ایک پکوان کی ہے کہ ایک خاص آنچ کے ساتھ متعدد اجزا سے تیار ہو کر ذائقہ دیتا ہے۔ خطابت میں آواز کا اتار چڑھاؤ اور لہجہ کا نشیب و فراز، اشارات کے طلوع و غروب سے با معنی ہوتا ہے۔ تقریر کے سحر و تاثیر میں کئی چیزیں کام کرتی ہیں۔ اس کا بنیادی وصف یہی ہے کہ نرم، آسان اور ہموار ہو۔ الفاظ سلاست کی لڑی میں موتیوں کی مالا نظر آئیں۔ اس سونے کا سہاگہ حاضر جوابی، حاضر ذہنی، حاضر کلامی اور برجستہ گوئی ہے۔ انہی سے چمک دمک بڑھتی ہے لیکن تقریر بہر حال آواز و لہجے کے نرم گرم اجزا کا آمیختہ ہے۔ اس میں غنچے کی چٹک، پھول کی مہک، صبا کی چال، بادل کی گرج اور رعد کی کڑک ہوتی ہے۔ ایک اچھی تقریر موتی کی آب، کندن کی دمک، ہیرے کی ڈلک، چاند کی چمک اور عطر کی لپٹ رکھتی ہے اور یہ اس کے مضمون

و موضوع کا ہالہ ہے۔

ایک خطیب یا مقرر اس صورت ہی میں جامع ہو سکتا ہے کہ خصائص خطابت کے اجزا سے بہرہ مند ہو اور اسے اس کے ٹھیک ٹھیک استعمال پر قدرت ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ متانت ظرافت (بہ معنی مطائبات) متخیلہ، تجربہ، تکنیک اور آواز خطابت کا زیور ہیں لیکن سلاست ان کا تنفس ہے۔ اس میں ہر طرح کے الجھاؤ سے خطابت مضمحل ہوتی ہے۔ جس مقرر یا خطیب میں سلاست کا جوہر کسی نسبت سے کمزور ہو گا اس نسبت ہی سے اس میں ابلاغ کا حُسن اور اظہار کا توازن کم ہو گا۔ خطابت میں سلاست نہ ہو تو خطابت کے دوسرے خصائص پھیکے رہتے ہیں بلکہ معنوی اعتبار سے معطل ہو جاتے ہیں بالفاظ دیگر خطابت کے عناصر ترکیبی کی شگفتگی و رفتگی کا انحصار سلاست اور صرف سلاست پر ہے۔ اس کے بغیر جو کچھ ہے وہ مواد ہے۔ اس مواد کا سانچہ سلاست ہے۔ سلاست فی نفسہٖ ایک ایسی چیز ہے کہ اس کے دامن میں بہت کچھ ہوتا ہے اور بعض دفعہ ایک تجرباتی مقرر اس سے کماحقہٗ فائدہ اٹھاتا ہے۔ کئی مرحلے یا موقعے ایسے ہوتے ہیں جہاں کسی مقرر یا خطیب کو بداہۃً بولنا پڑتا ہے۔ اور اُس وقت مجمع کا اصرار یا موقع کی ضرورتِ متقاضی ہوتی ہے۔ اس حالت میں سلاست ہی ایک ایسی طاقت ہے جو مخاطبت کی فضا پیدا کرتی اور خیالات کو ایڑ لگانے میں کام آتی ہے۔ عربی خطابت کا سب سے بڑا حُسن سلاست تھا۔ اور وہی لوگ درباروں اور بازاروں میں کامیاب ہوتے تھے جنہیں قدرت نے زبان میں طلاقت کے ساتھ، بیان میں سلاست کا جوہر دیا تھا۔ جب تک کوئی شخص مافی الضمیر کہنے پر قادر نہ ہو، اس کی تقریر نہ مؤثر ہوتی ہے اور نہ وہ اپنی تقریر عوام کے ذہنوں میں اتار سکتا ہے۔ سلاست، خطابت کی شریانوں کا خون ہے۔

فی زمانہ مجمعوں کی ہیئتِ کذائی کے بدل جانے اور تقریروں کے نشریاتی ہو جانے سے تحریریں بھی تقریریں شمار ہونے لگی ہیں۔ اس قسم کی تحریروں میں انشا کی لیپاپوتی

کو ملحوظ رکھا جاتا اور بولتے وقت گفتگو کا رنگ و روغن زبان کے ساتھ ہوتا ہے لیکن تحریر بہر حال تحریر ہے اور تقریر بہر حال تقریر ہے، اکثر خطاب شخصیتوں کی وجہ سے قبول عامہ حاصل کرتے ہیں لیکن خطابت تحریری ہو تو خطابت نہیں کچھ اور کہہ لیجیے۔ ایک نثری تقریر اپنے تحریری سانچہ میں ڈھل کر اپنی شخصیت کے ساتھ مثبت و منفی نتائج پیدا کرتی ہے لیکن مقرر ارتجالاً بول نہیں سکتا، بداہۃً اپنے حافظہ سے مدد نہیں لیتا تو اس کے لیے تقریر کرنے سے تقریر نہ کرنا زیادہ بہتر ہے۔ تقریر کا پڑھنا خطابت نہیں۔ اپنے مطالعہ کی طاقت پر فی البدیہہ بولنا تقریر و خطابت ہے۔ بعض استثنائی حالتوں کے سوا لوگ تحریری خطابت کو اس کا ذوق وجذبہ سے نہیں سنتے جو فن خطابت کا خاصہ ہے۔ اس کا مجمع عام پر قوتِ انشا کی دلفریبی کے باوجود اثر پیدا نہیں ہوتا جو خطابت کا لازمہ ہے۔ تحریر آنکھوں کی اور تقریر کانوں کی چیز ہے۔ تحریر خلوت چاہتی، تقریر جلوت۔ دونوں کے دوائر مختلف ہیں۔ ایک طویل خطبہ پڑھنے سے چند زبانی فقرے مجمع کے لیے زیادہ موثر ہوتے ہیں۔ تقریر ہر حال میں تقریر ہونی چاہیے۔ اگر لکھ کر پڑھنا ہے تو ریڈیو ہے، علمی تقریبیں ہیں، اخبارات و رسائل ہیں ان میں چھپوا دیجیے۔ کسی طرح بھی تحریر مجمع عام کی چیز نہیں اور نہ اس سے خطابت، موضوع اور عوام کی سہ رنگی کے باوجود وحدت پیدا ہو سکتی ہے۔

..... یہ سوال کہ سلاست کیوں کر پیدا ہو، تو یہ مشکل نہیں۔ آپ کی آواز بے عیب ہے اس میں کوئی نقص نہیں تو زبان کی لہروں پر قابو پایئے، خزانہ الفاظ بڑھاتے رہیے، افکار و مطالب کو وسیع کرتے جایئے اور تلفظ کی صحت کے ساتھ بول چال کا ملکہ پیدا کیجیے۔ نتیجتاً سلاست بڑھے گی۔ قوتِ متخیلہ کو راہ ملے گی اور اظہار و بیان میں صحت و توازن پیدا ہوں گے۔

ایک عام آدمی کا سرمایہ الفاظ سوڈیڑھ سو الفاظ ہوتے ہیں اور وہ ان کے ہیر پھیر ہی سے بات چیت کرتا ہے۔ ظاہر ہے ایسا آدمی نہ تو شستگی سے بول سکتا ہے نہ عمدگی

سے سوچ سکتا ہے اور نہ جو کچھ اس کے دل یا دماغ میں ہے، کماحقہٗ بیان کر سکتا ہے۔ حقیقتاً ایسا شخص نصف گونگا ہے، اس کے خیالات کا دم گھٹا رہتا ہے۔

ایک چھوٹے سے لغت میں بیس اور پچیس ہزار الفاظ ضرور ہوتے ہیں لیکن ایک عمومی مشاہدہ کے مطابق مقررین پانچ یا سات فیصد سے زیادہ الفاظ نہیں جانتے۔ ان کی پونجی محدود ہوتی ہے۔ اسی طرح عوام یہ تو محسوس کرتے ہیں کہ مقرر جو کچھ کہہ رہا ہے وہ ان کے دل کی آواز ہے لیکن وہ خود کہنا چاہیں تو ان الفاظ پر قدرت نہیں رکھتے، ان کا فہم ضرور رکھتے ہیں۔ اکثر مقررین کا سرمایہ الفاظ اتفاقی ہوتا ہے۔ وہ عام مطالعہ سے الفاظ کا ایک ذخیرہ حاصل کر پاتے ہیں۔ خطیب ایک طرف رہے، اکثر صحافی، ادیب اور شاعر بھی لغت کو بطور لغت مطالعہ نہیں کرتے اور نہ الفاظ کی معنوی رُوح میں اترنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو کچھ مطالعہ سے ان کے حافظہ میں اکٹھا ہو جاتا، وہی ان کے قلم و زبان کی معرفت صرف ہوتا ہے۔

ایک مقرر کے لیے ذخیرۂ الفاظ سب سے بڑی دولت ہے اور اس دولت کا صحیح مصرف سب سے بڑی نعمت! اور وہی قلم و زبان کے دھنی اور غنی ہوتے ہیں۔ مقرر کا فرض ہے کہ زبان کے رموز و حقائق سے واقف ہو اور جانتا ہو کہ الفاظ کیونکر ترتیب پاتے اور ان کی معنوی شکلیں کیا ہوتی ہیں۔ حرف صورت کی نمائندگی کرتا اور لفظ جذبات، احساسات و تصورات کا نمائندہ ہوتا ہے۔ فی الجملہ لفظ کے اجزائے ترکیبی حروف اور زبان کے اجزائے ترکیبی الفاظ ہیں۔ ایک مقرر کے لیے الفاظ، محاورے، روزمرہ، ضرب الامثال، حکایتیں، تمثیلیں، لطیفے، بذلے، مطائبات، مرکبات، مترادفات، ضمیریں، تذکیر و تانیث اور صرف و نحو کا مطالعہ و علم، فنی طور پر ریڑھ کی ہڈی ہے یا پھر خطابت کی نشو و نما کے لیے غذا..... لیکن ان پر قابو پانے ہی سے کاملیت حاصل ہوتی اور زبان و بیان کی راہیں کھلتی ہیں۔ جب تک مقرر کو الفاظ کے صحیح استعمال میں قدرت حاصل نہ ہو، نہ اس کے اظہار و اسلوب میں رونق پیدا ہو سکتی اور نہ اس کی

قوتِ فکر چلا پا سکتی ہے۔ اس سلسلہ کی ایک بڑی چیز جو خطابت کے فن کو متجلی کرتی ہے، وہ مترادف الفاظ کا حفظ و آشنائی ہے، یا پھر ان کے ٹھیک استعمال کا فن ہے۔ یہ صحیح ہے کہ متصرفہ زبانوں میں مترادف و ہم معنی الفاظ نہیں ہوتے۔ وہاں ہر لفظ کا مادّہ جداگانہ ہوتا ہے۔ لیکن اُردو کا خزانہ چونکہ مختلف زبانوں کے الفاظ سے بھرپور ہے۔ اور اُن میں تھوڑا بہت تغیر ہو چکا ہے۔ اس لیے اُردو میں مترادفات کا ایک ڈھیر ہے اور لغت کے سَرفی صد الفاظ مترادفات رکھتے ہیں۔ گو ان الفاظ میں بھی ایک امتیازی خط ضرور ہوتا ہے جو ذوق کی نفاست اور طبیعت کی نزاکت فوراً بھانپ لیتی ہے لیکن بہر حال ہم معنی الفاظ کی بہتات اُردو کا ایک ایسا حُسن ہے کہ زبان و بیان کے ہر معرکہ میں اس سے کام لیا جاتا اور اسلوب و اظہار کے مختلف پیرائے اس سے روشن کیے جاتے ہیں۔

ایک مقرر و خطیب کے لیے مترادف (ہم معنی الفاظ) شعلہ نوائی کا ایندھن ہیں۔ چند الفاظ ملاحظہ فرمایئے: اچھا برا، حُسن و قبح، خیر و شر، زشت و خوب، بہتر و بدتر، یہ معنوی تفاوت کی باریکی کے استعمال میں انشا و بیان کا فاصلہ ہے اور یہی فاصلہ ان کی معنویت کے یکساں خطوط کو ایک دوسرے سے ممیّز کرتا ہے اور ایک خطیب و ادیب ان کے معنوی استعمال ہی سے منفرد و ممتاز ہوتا ہے۔ ان کے استعمال کی شکلیں ملاحظہ ہوں:

1) اس کا آغاز اچھا لیکن انجام بُرا ہے۔

2) ایک نقاد کے لیے بسا اوقات نقد و نظر کے میدانوں میں حُسن و قبح کی تلاش مشکل ہو جاتی ہے۔

3) انسانی فطرت میں خیر و شر دونوں موجود ہیں۔

4) زشت روئی مقرر کی شخصیت کو ہلکا کرتی ہے اور خوب روئی سے اس کی تاثیر بڑھ جاتی ہے۔

5) بہتر لوگ اٹھ گئے، اب بدتر لوگوں سے واسطہ پڑا ہے۔

ظاہر ہے ان فقروں کی ساخت بدل کر بھی ان کے مترادف الفاظ کو ان میں کھپا نہیں سکتے۔ کسی بیرے یا فقرے میں برجستہ الفاظ کا حُسنِ استعمال ہی فصاحت و بلاغت کی اصل ہے۔ جس مقرر کو الفاظ و استعمال پر قدرت ہو گی، اس کا دلوں میں اتر جانا یقینی ہے اور وہ عوام سے مخاطب ہو سکتا ہے لیکن ایک چیز ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے کہ جو الفاظ لوگوں کی زبان پر چڑھ کر اپنی توقیر کھو بیٹھتے ہوں اور تحریک کے نعرے نہ ہوں، کسی حال میں بھی عوام میں زور یا تاثر پیدا نہیں کرتے بلکہ ساون کے بادلوں کی طرح گزر جاتے ہیں۔ اس قسم کے خطیب صحرائی بادلوں کی طرح ہیں۔ وہ چیز جس کا نام بیان کا جادو ہے، ہر مقرر کی انفرادیت اور الفاظ کی وجاہت سے پیدا ہوتا ہے۔ بھولیے نہیں کہ الفاظ کا بانکپن فقروں کی آرائش سے ابھرتا اور مقرر کا جوبن اظہار و اسلوب کے زاویوں سے مترشح و مرتب ہوتا ہے۔

خطابت میں تمام خصائص لکھے جاتے ہیں، الفاظ کا ذخیرہ بڑھانے سے بڑھتا ہے جس موضوع پر کتاب پڑھیے، وہ اگر بعض اعتبارات سے نئی ہے تو اچھوتے فقروں اور شگفتہ خیالوں ہی کو نوٹ کیجیے بلکہ نئے لفظوں کو بھی معانی سمیت نوٹ کیجیے۔ پھر انہیں ذہن میں دہراتے رہیے۔ اسی طرح آپ کے الفاظ کا ذخیرہ بڑھے گا اور کچھ عرصہ بعد آپ محسوس کریں گے کہ آپ کے اظہار کی طاقت بڑھ گئی ہے۔ حتیٰ کہ ایک دن یہی چیز آپ کے لیے گنج شائیگاں ہو جائے گی۔ آپ کے الفاظ آپ کے ذہن کا بجٹ ہیں۔ اسی طرح بعض نامور مقرروں کو ضرور سنیے، ان کی تقریروں سے کئی چیزیں حاصل ہوں گی۔ نئے الفاظ، تلفظ کی صحت، فقروں کی ترکیب، خیالات کی بوقلمونی، استدلال کے زاویے اور مطالب و معانی کے خفی و جلی پہلو، اس کے علاوہ اشارات و حرکات کا مدوجزر معلوم ہو گا اور اظہار و اسلوب سے آشنائی ہو گی کہ وہ کون سی چیز ہے جو ایک خطیب کے لیے عوام میں تجسس اور مقصد کے لیے جذبہ پیدا کرتی ہے۔

دوسری چیز جو مقرر کے لیے ضروری ہے وہ شعرا کے کلام کا مطالعہ ہے۔ کلام کو سنیے بھی اور پڑھیے بھی۔ اس سے بہت کچھ حاصل ہوتا ہے۔ شاعری سے سلاست پیدا ہوتی ہے، الفاظ کے استعمال کا پتہ چلتا ہے، مترادفات ہاتھ آتے، بیان میں زور ابھرتا اور تلفظ معلوم ہوتا ہے۔ سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ شاعری کے ذوق و شوق سے خطیب کے بیان میں دلکشی اور دلفریبی پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح اچھے انشاپردازوں کا مطالعہ علم و لغت کی توسیع کے علاوہ، بیان اور اس کی تاثیر میں ندرت و اعجاز کا موجب ہوتا ہے۔

راقم نے جدید و قدیم دونوں ادوار کے خطیبوں اور مقرروں کو سنا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُردو کے وہ خطبا جو عربی و فارسی سے نابلد ہیں، اپنے مطالعہ کا انحصار انگریزی پر رکھتے اور صوبائی یا اضلاعی زبان میں سوچ کر اخباری مطالعہ کی بنا پر اُردو میں خطاب کرتے ہیں۔ وہ مطالعہ کی وسعت کے باوصف خطابت میں تاثیر پیدا نہیں کر سکتے۔ ان کا شعلۂ گفتار فنی طور پر جلد بجھ جاتا اور وہ بیان کے اختصار پر تقریر سمیٹ دیتے ہیں۔ اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ انہیں اُردو زبان سے لگاؤ نہیں۔ وہ اُردو کتب کو مطالعہ کے لائق نہیں سمجھتے، انگریزی کی مہارت پر بھروسا کرتے اور اُردو کو اس کے رسائل و صحائف سے حاصل کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں متقدمین کے ادب کا مطالعہ ضروری ہے۔ اس کے مطالعہ سے خصائص خطابت کے حصول میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔ فی زمانہ روایت اور ہیئت کے نام سے اُردو میں جو تجربے کیے جا رہے ہیں اور زبان پر خیال کو ترجیح دی جا رہی ہے مثلاً نظم معریٰ و نظم آزاد یا بعض دوسرے شعری سلسلے جو نئی طرز کے آہنگ میں ڈھل رہے ہیں اور یورپ کی مختلف ادبی تحریکوں کا اُردو نظم و نثر میں تجربہ ہیں، وہ بہت کچھ ہو سکتے ہیں لیکن ان سے اُردو اظہار و اسلوب میں رونق پیدا نہیں ہو سکتی اور نہ زبان و بیان میں فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ کسی جدید مقرر نے کبھی اس سے متمتع ہونے یا اپنے بیان میں توانائی پیدا کرنے کا حوصلہ نہیں کیا۔ ہماری خطابت کا

میدان ان تجربوں سے خالی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نئے ادیبوں اور جدید شاعروں کی اکثریت زُبان و بیان میں وجاہت اور شکوہ پیدا کرنے سے معذور ہے۔ اس پود کے ادیب کئی زُبانوں کی ادھوری نسل ہیں۔ اکثر افسانہ نگار ادب کی ابکائی ہیں یا پھر ذہنی عیاشی ہیں۔ ظاہر ہے کہ عیاشی میں ربط نہیں ہوتا۔ اس سے وقتی طور پر مصنوعی مسرت حاصل کی جاتی ہے اور وہ شاعر جنہوں نے اُردو میں ہیئت و روایت کے تجربے کیے اور غور و فکر کی نئی راہیں اٹھائی ہیں، تو ان کے ادب و احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے مجھے اپنی بے بضاعتی کا اعتراف کرنے میں ذرہ برابر ہچکچاہٹ نہیں کہ مَیں ان کے فکرِ رسا تک نہیں پہنچ سکا۔ مجھے ان کی اکثریت ذہنی طور پر سیہ کار معلوم ہوتی ہے۔ ان کے نزدیک ابہام و الحاد کا نام شاعری ہے۔ اس پود کا سرمایہ الفاظ نہایت قلیل، ذخیرہ الفاظ نہایت مجروح اور طرز و اسلوب نہایت مریل ہے۔ اپنے قاری و سامع کو نفسی ہیجان کے سوا کچھ نہیں دے سکتے۔ ان کا بڑا حصّہ خلوت خانہ افکار کا عیاش ہے۔ بقول اسد ملتانی ع

وہ بوالہوس کہ جنہیں جبر آیتِ گناہ نہیں
ادب میں ڈھونڈ رہے ہیں علاجِ تشنہ لبی

کئی دفعہ مجھ سے بعض نوجوان مقرروں نے سوال کیا کہ روزی کس طرح پیدا ہوتی ہے؟ سوال مشکل نہ تھا۔ جواب سہل ہے کہ روزی آواز کی تربیت اور الفاظ کے حُسن سے پیدا ہوتی ہے اور اسلوب مطالعہ کی وسعت سے جنم لیتا ہے۔ تیز بولنے کی عادت ڈالیے لیکن تقریروں میں تیزی کے معنی، موسلا دھار بارش کے نہیں اور نہ شور و غل کے ہیں۔ جس چیز کا نام طلاقتِ لسانی ہے وہ دریا کے بہاؤ کی طرح ہے جس بانکپن سے دریا کی لہریں جنتی اور اٹھکیلیاں کرتی بہتی ہیں، اسی طرز و روش ہی سے ایک خطیب کی زُبان و بیان میں خصائص خطابت کا امتزاج ہوتا ہے اور وہ اپنے اظہار و اسلوب سے آب رکنا باد و گلگشت مصلےٰ کا سماں پیدا کر دیتا ہے۔ فی الجملہ خطابت الفاظ کی ژالہ باری نہیں، الفاظ کی گلباری ہے۔ ایک مقرر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ لالہ

زارِ خیال کے مختلف تختوں میں گھماتا اور کار زارِ خطابت کے مختلف محاذوں پر لے جاتا ہے۔ وہ جذبات کی لہروں میں تلاطم و تموّج پیدا کرتا اور متضاد و متحرک کیفیتوں کو اچھالتا اور اجالتا ہے۔ اس کے فن کا سہاگ، سلاست کے حُسن میں حاضر کلامی، حاضر دماغی اور برجستہ گوئی کی شہابی لہریں ہیں۔ جن سے سماعت تسخیر ہوتی اور رنگارنگ ذہن، ایک ساتھ جاگ اٹھتے ہیں اور طبائع کا ہجوم جذبہ کی وحدت میں ڈھل جاتا ہے۔ کچھ لوگ دماغی اعتبار سے کمزور ہوتے ہیں۔ اُن کے لہجہ میں قدرتی اٹکاؤ پیدا ہو جاتا ہے لیکن یہ مسئلہ طب کا ہے۔ ہر تندرست دماغ قوتِ حافظہ سے چمکایا اور دہکایا جا سکتا ہے۔ جو لوگ رک رک کر بولتے وہ رواں ہو سکتے ہیں، اور جو سست ہیں، وہ تیز ہو سکتے ہیں۔ آہستہ گفتاری کی فضا محدود ہے۔ ایک خطیب کے لیے مفید نہیں لیکن نرم گفتاری اس سے مختلف چیز ہے اور نجی صحبتوں میں تمنا کا حُسن پیدا کرتی ہے۔ جب تک مقرر لب و لہجہ کے اتار چڑھاؤ کا رمز دان نہ ہو، اور اُس کو الفاظ کے صوتی حُسن میں گونج گرج پیدا کرنے کا ملکہ حاصل نہ ہو، وہ کبھی کامیاب مقرر نہیں ہو سکتا اور نہ اس کی تقریر موضوع کے نتائج پیدا کر سکتی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ خطابت کا ملکہ وہبی ہوتا ہے۔ ایک ایسا شخص ذوق و شوق اور محنت و ریاضت سے پہلے جلد اپنے اندر ایک مقرر کی خوبیاں پیدا کر سکتا ہے۔ عادت بنا لیجیے کہ آپ زیرِ مطالعہ کتاب کے چند صفحے مطالعہ کی خلوت میں تیزی اور شیرینی سے پڑھیں، ممکن ہے شیرینی کا لفظ بے محل ہو۔ اس سے مراد لہجہ کی مٹھاس ہے۔ الفاظ کو آوارہ دھنوں کی طرح پھینکنا یا اس قسم کا تاثر دینا کہ الفاظ تے کیے جا رہے ہیں، بنیادی طور پر غلط ہے۔ ان میں مضراب کے تاروں کی سی ہم آہنگی پیدا کرنا ہی ان کا حُسن ہے کہ اس حُسن ہی سے نغمہ پیدا ہوتا اور وجدان حظ اٹھاتا ہے اور یہی چیز غالب کے الفاظ میں فردوسِ گوش ہے۔ الغرض مطالعہ و آواز کی کیفیتوں کے اظہار و اسلوب کے سانچے میں ڈھلنے کا نام سلاست ہے۔ اس کی تشریح یوں کی جا سکتی ہے کہ لہجہ کا متوازن رہنا،

آواز کا بے قابو نہ ہونا اور تسلسل سے نہ چلنا، سلاست کی اساس ہے اس کو الفاظ کا سنگار، افکار کا نکھار اور مطالعہ کی بہار سے جِلا ملتی ہے۔

اب یہ معلوم کرنا سہل ہو چکا ہے، کبھی مشکل تھا کہ مختلف نامور مقرروں کی رفتار سلاست اور اُن کے الفاظ کا مدوجزر کیا ہے۔ پہلے صرف رپورٹروں کی روایت پر انحصار تھا لیکن اب ٹیپ ریکارڈ کی ہوئی تقریروں سے مسئلہ صاف ہو گیا ہے۔ ایک عمومی روایت کے مطابق مولانا ابوالکلام آزاد ایک منٹ میں تین سوا تین سو الفاظ بولتے تھے۔ مولانا محمد علی جوہر بھی اس کے لگ بھگ رفتار رکھتے تھے۔ مولانا ظفر علی خاں کا حد اوسط بھی یہی تھا۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری ابتداً اتنے ہی الفاظ بولتے تھے۔ پھر ساحرانہ خطابت کی بعض دوسری نزاکتوں کے باعث ان کی رفتار قدرے کم ہو گئی۔ انہوں نے ایک ٹھہراؤ پیدا کر لیا۔ نواب بہادر یار جنگ کو سنا نہیں، لیکن اُن کی رفتار بھی یہی بیان کی جاتی ہے۔ میں شروع میں خود ڈھائی تین سو الفاظ بولتا تھا۔ پھر بہت جلد یہ رفتار تین سوا تین سو الفاظ تک چلی گئی۔ بسا اوقات اس سے بڑھ گئی۔ اب عمر کے ساتھ گھٹ چکی ہے۔ لیکن جو چیز سلاست ہے وہ الفاظ کی بوچھاڑ یا آواز کی رفتار نہیں بلکہ ان دونوں کا ارتباط و امتزاج ہے کہ اس میں کوئی اٹکاؤ یا گھٹاؤ تو نہیں اور مقرر جو کچھ کہہ رہا ہے، ہم اس کا ساتھ دے رہے ہیں یا اس سے بچھڑ کے رہ گئے ہیں۔ یا اس کے خروش کا شکار ہیں۔ اگر کسی خطیب یا مقرر کے الفاظ و معانی، سمع کا ساتھ نہیں دے رہے یا ان سے ہمارے جذبات انگڑائی نہیں لے رہے اور ہم اُس کے خیالات سے تہی دامن ہیں، تو یہ خطابت نہیں۔ زبان کا ناٹک ہے یا الفاظ کا بازیچہ۔ جو رنگوں کی طرح ابھر کر غائب ہو جاتا ہے۔ روانی تب ہی دلکشا ہوتی ہے کہ روانی رہے، طغیانی نہ ہو۔ اس کا دوسرا مطلب جذبات کا ایجان اور الفاظ کا ہذیان ہے۔ کوئی مقرر ہیجان و ہذیان سے واضح نہیں ہوتا۔ بعض مقرر کھنکھارنے لگتے، ان کا رنگ بدل جاتا، ماتھے پر قطرے آجاتے، بدن پر رعشہ سا پیدا ہوتا، تحت الشعور غائبانہ گرفت میں آجاتا، الفاظ اٹکنے

لگتے، ہونٹوں سے جھاگ چھوٹتی، اشارات مضحک ہو جاتے، لیکن یہ حالتیں یا کیفیتیں عارضی ہوتی ہیں۔ ان سب پر بعجلت و بہ آسانی قابو پایا جاسکتا ہے اور اس کا واحد علاج خود اعتمادی ہے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہر مقرر کے لیے کوئی حجاب باقی نہ رہے۔ اس کی زبان میں روانی اور ذہن میں کہانی ہو۔ اس کو جو کہنا ہے، کہتا جائے۔ کوئی اٹکاؤ محسوس نہ کرے، رواں دواں رہے، یہی سلاست ہے۔ کئی دفعہ بعض مقرر اپنے طور پر مضمون و موضوع میں دسترس نہ ہونے کے باعث تشنگی محسوس کرتے اور ذہنی خلا کے باعث رکتے ہیں۔ یہ چیز طلاقت لسانی کے لیے ایک عیب ہے لیکن مضمون و موضوع کے اس خلا میں بھی جو چیز "عیب پوش" ہوتی ہیں، وہ سلاست ہے یا پھر مزاج کی شگفتگی جو ان موقعوں میں خود اعتمادی کا پرتو کہی جاسکتی ہے۔ یہ ایک واضح امر ہے کہ عوام کے مجمعوں میں محض منطق یا محض فلسفہ کام نہیں آتے اور نہ اعداد و شمار کی پیوست اور لب ولہجہ کی شقاوت تاثیر پیدا کرتی ہے۔ کئی مقرر غیر ضروری متانت میں کھو کر عوام کو واقعی جذبہ سے محروم رکھتے اور الفاظ کی بوجھل احتیاط سے مضمون کو کھلنے نہیں دیتے۔ اس طرز بیان کو کسی حد تک صحافت میں گوارا کیا جاسکتا ہے لیکن خطابت کا مزاج اس سے قطعاً مختلف ہے۔ تقریر نام ہے، دماغوں کو اُجالنے، دلوں کو بھڑکانے اور طبیعتوں کو اٹھانے کا اور یہ خوبی سلاست میں ہے کہ طبائع کی رنگا رنگی کے باوجود، مجمع میں ایک ایسی وجدانی وحدت پیدا کرتی ہے کہ عوام پرسش کی بجائے پرستش کے ہو جاتے ہیں۔ کوئی مقرر عوام کو اپنے ساتھ لے کر نہیں چلتا تو اس کے متعلق یہ رائے قائم کرنا غلط نہ ہوگا کہ نفسیاتِ عوام سے نابلد ہے۔ اس کی ذمہ داری ہے کہ مخاطبین کو مطمئن کرے۔ اس کے برعکس ادیب جو کچھ کہتا، اس کے تاثر سے بے نیاز ہوتا ہے۔ وہ قرطاس و قلم کا انسان ہے۔ اس کے قارئین سامنے نہیں ہوتے اور نہ ان سے عوام کی وحدت کا مطالبہ کیا جاسکتا ہے۔ جہاں تک شعر و انشا کا تعلق ہے، ہر طبیعت پر یکساں اثر نہیں ہوتا۔ ہر شخص کا تاثر مختلف ہوتا ہے اور یہی چیز اچھے شعر اور اچھی نثر کا حُسن

ہے۔ ایک مجمع کو اُس کے مزاج و طبیعت کی رنگارنگی کے باوصف جسم کو واحد بنا دینا خطابت ہے اور خطابت کی رُوح سلاست ہے۔ جو مقرر کو استرداد کی رسوائی سے محفوظ رکھتی اور استدلال کی ثقاہت میں سپر ہو جاتی ہے۔ سلاست آورد نہیں آمد ہے۔ طبیعت کھل ہو تو خیالات خود بخود بکھرتے چلے جاتے ہیں اور سلاست میں پیکِ صبا کا خرام آ جاتا ہے۔ طبیعت منقبض ہو تو دماغ معطل اور دل منقبض ہو جاتا ہے۔ اس حالت میں سلاست منجمد ہو جاتی ہے۔ سامعین قہقہے پھینکتے یا ابکائیاں لینے لگتے ہیں۔ یہ حال ہو تو مقرر کا تقریر کرنے سے تقریر نہ کرنا بہتر ہے۔ کیونکہ تقریر الفاظ کا ڈنٹر پیلنے کا نام نہیں اور نہ لہجہ کی تھکاوٹ، خطابت کے لیے ساز گار ہے۔ تقریر کے لیے پہلی چیز مقرر کی بشاشت ہے اور بشاشت کا مطلب ہے دماغ و دل کی طراوت، ایک مسرور مطمئن مقرر ہی عوام سے خطاب کرنے کا حوصلہ کر سکتا اور اس پر قادر ہوتا ہے۔ جس مقرر کی طبیعت شگفتہ نہ ہو اور اس نے اپنے وجود پر ایک مصنوعی سنجیدگی طاری کر رکھی ہو، وہ عوام سے مخاطبت کے باوجود نہ تو خطابت کی رنگارنگی قائم کر سکتا اور نہ آواز و بیان سے تاثر پیدا کر سکتا ہے۔

تقریر گفتگو نہیں لیکن موضوع کی رعایت سے بعض مجمعوں کے لیے گفتگو کا انداز مؤثر ہوتا ہے۔ لیکن گفتگو کا مطلب نجی محفلوں کے آداب کلام کی وضعداری نہیں۔ جب موضوع کسی تحریک و ترغیب کے لیے نہ ہو، بلکہ مقصود و افہام و تفہیم ہو، تو گفتگو کا انداز ہی بہترین انداز ہے۔ اس سلسلہ کی بنیادی چیز یہ ہے کہ کسی مقرر کی نقل نہ کریں نہ اس کی کاپی بنیں اور نہ تتبع یا تصنع سے کام لیں۔ نہ لوگوں کو بنائیں اور نہ خود بنیں۔ ممکن ہے اس طرح آپ فائدہ اٹھالیں لیکن یہ تمام چیزیں شعلۂ مستعجل ہیں۔ آپ اس طرح اپنے لیے کوئی مقام پیدا نہیں کر سکتے اور نہ اپنے اشہب کے سوار ہو سکتے ہیں۔ کسی خطیب یا مقرر میں ذاتی انفرادیت نہ ہو تو عوام کے ذہنوں پر اس کی چھاپ لگنا مشکل ہے، انفرادیت کوئی فیشن نہیں، نہ کسی رسم کا نام ہے۔ اور نہ کوئی مشترک چیز

ہے۔ ایسی ادا بھی نہیں جو سب کے لیے یکساں ہو۔ انفرادیت ہر شخص کے خط و خال کی طرح جداگانہ ہے۔ ایک ایسا تاثر ہے جو بہ قول شاعر.....ع

آدمی محسوس کر سکتا ہے، کہہ سکتا نہیں

اور کہنا چاہے تو الفاظ یکساں نہ ہوں۔ یہ کہہ لینا آسان ہے کہ فلاں شخص کی طرح بولتا ہے، لیکن جس کی طرح بولتا ہے وہ کیونکر بولتا ہے؟ اس کی تصویر کشی سہل نہیں؟ تمام خطبا کی انفرادیت، کان کی نہیں، آنکھ کی چیز ہے اور خطابت میں انفرادیت ہی ایک ایسی چیز ہے جس میں بصر کا وزن سمع سے زیادہ ہے۔

کمالِ فن یہی ہے کہ فن کو ہاتھ سے نہ دو لیکن کسی حالت میں عوام یہ خیال نہ کریں کہ فن کی نمائش جاری ہے۔ عوام کا بدیہی تاثر یہ ہونا چاہیے کہ بے ساختہ بول رہا ہو اور جو کچھ کہہ رہا ہے ہمارے دلوں کا اثاثہ ہے۔ ہم کہہ نہیں سکتے لیکن وہ ہمارے جذبات کی تختی سے گھرچ کر زبان پر لا رہا اور ہمارے دماغوں کو لوٹا رہا ہے۔

خطابت اداکاری نہیں اور نہ مقرر کسی ناٹک یا کھیل کا اداکار ہے۔ اپنے چہرے مُہرے پہ اداکاری جلال و جمال پیدا کرتا ہے تو ممکن ہے مجمع کے جزو وکُل میں کوئی عارضی لہر پیدا ہو لیکن ایک ڈرامائی کیفیت ہوگی کہ بگٹٹ آتی اور بگٹٹ چلی جاتی ہے۔ یہ کہنا شاید نفس مضمون کی رعایت سے کسی حد تک صحیح ہو کہ خطیب میں اداکار کی فنی خوبُو کا پر تو ضرور ہوتا ہے لیکن یہ کوئی لازمہ نہیں۔ اداکار تماشہ ہوتا، ناظرین تماشائی، خطیب راہنما ہوتا، سامعین راہرو۔ فی الجملہ اداکار کا فن مسرت اور خطیب کا فن عزت ہے، ظاہر ہے کہ اداکار کا فن اُس کا پیشہ اور خطیب کا فن اُس کا فرض ہے اور فرض کسی تصنع سے ادا نہیں ہوتا۔ اس کی اساس عشق و اخلاص پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عوام مقرر کے اخلاص پر جان چھڑکتے ہیں اور اخلاص ایک بے میل سچائی کا نام ہے۔ خطابت کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ مقرر سے لے کر تقریر تک سب کچھ غیر مصنوعی ہو۔ کسی پہلو سے کوئی چیز مصنوعی ہوگی، تو حشو و زوائد ہوگی۔ کسی پبلک

جلسہ میں عوام تماشہ دیکھنے کے لیے نہیں، کچھ پانے کے لیے آتے ہیں اور ہمیشہ اخلاص سے مسخر ہوتے ہیں وہ بات ضرور کہیے جو آپ کے دل میں ہے اور صحیح ہے اور جس پر آپ اعتقاد رکھتے ہیں۔ ایسی کوئی بات جو آپ کے نزدیک صحیح نہیں اور آپ کا ضمیر اس سے متفق نہیں، صرف اس لیے نہ کہیے کہ آپ مقرر ہیں اور تقریر کرنے کی آپ سے فرمائش کی گئی ہے یا آپ طوعاً و کرہاً خطاب کرنے آگئے ہیں۔ اس حالت میں آپ کی کامیابی مشکوک ہے۔ آپ مجروح احساسات کا شکار ہوں گے اور دورانِ تقریر آپ کے ذہن و زُبان یا ضمیر و گفتار میں ایک ایسی کشمکش رہے گی جو خطابت کے لیے اختلاجِ انقلاب ہے۔ ایک بڑا انسان ہونا تو بہت بڑی چیز ہے۔ اس تضاد سے آپ اُس بڑائی کو خود ضائع کرتے ہیں جو فنِ خطابت کی بدولت حاصل ہو سکتی ہے۔ کوئی اسلوب، کوئی تکنیک اور کوئی ڈھنگ بے ریائی، اور اخلاص کی جگہ نہیں لے سکتا۔ ایک مقرر کی سب سے بڑی کامیابی اپنے افکار و خیالات سے اُس کا عشق ہے۔ عشق سچّا ہوگا، تو لوگوں کے جذبے کو محیط ہوگا اور خطیب کی آواز کا حُسن سامعین کے چہروں پر دمک اٹھے گا۔ خطابت میں دماغوں کو منایا نہیں، جیتا جاتا ہے اور یہ فتح اُس صورت ہی میں حاصل ہوتی ہے کہ جس صداقت سے مقرر کا دل معمور ہے۔ وہ سامعین کے دلوں میں اتار دی جائے، لوگ بادۂ سخن سے سرشار ہو جائیں اور اُن کے چہرے صدا دیتے ہوئے معلوم ہوں کہ ع

خم لگا دے مرے منہ سے تیرے میخانہ کی خیر
ایک دو جام سے ساقی مرا کیا ہوتا ہے!

اپنی شخصیت کو تقریر کے دوران بُت نہ بنائیے۔ نہ اپنی اہمیت جتائیے۔ آپ کی اہمیت آپ کی خطابت ہے۔ تکلف سے بولنا خطابت کا ہکلاپن ہے اور خود پسندی خطابت کے لیے زہر ہے۔ اپنی انا پر قائم رہنا، شخصی کردار کا حُسن ہے۔ لیکن خطابت کے دوران انا کا اظہار اور اس پر اصرار شترگربہ ہے۔ بعض خطبا اس معراج پر ہوتے

ہیں کہ انا ان کی شخصیت میں دمکتی ہے لیکن یہ استثنا ہے۔ اس پائے کے لوگ خال خال ہوتے اور علم و نظر کی بلندیوں سے خطاب کرتے ہیں۔ کئی راہنما خطیب نہیں ہوتے، ان کی شخصیت ایک ہمہ گیر تحریک کے داعی اور ایک قومی تنظیم کے پیشوا کی ہوتی ہے۔ ان کی ذات تحریک و تنظیم کے مرجع و محور کی ہوتی ہے۔ ان کی سیادت سے تحریک و تنظیم کے سبھی اوضاع و ارکین مستفید ہوتے ہیں۔ مثلاً علامہ اقبالؒ، قائد اعظمؒ، مہاتما گاندھی، اور پنڈت نہرو ملکی سیاست اور قومی ذہانت کے عظیم راہنما تھے۔ ان کے دائرے میں کوئی عصری راہنما ان کے برابر نہ تھا۔ وہ راہنماؤں کے راہنما تھے۔ یہ واقعہ ہے کہ وہ خطیب نہ تھے۔ ان میں مقرر کے خصائص ضمنی طور پر اور کسی حد تک محدود تھے۔ ان کی سیاسی اور فکری شخصیتیں اتنی بلند پایہ تھیں کہ خطابت ان سے فیض حاصل کرتی تھی، وہ خطابت کے مرہون نہ تھے۔ ملک کے اکثر خطیب ان کی شخصیت سے اپنے مضمون کو بالا کرتے اور تحریک کی جوت جگاتے خود ان کے لیے خطابت کوئی فن نہ تھا۔ بعض رعایتوں سے خطابت مستقل مضمون نہیں جس طرح زمانہ بدلتا ہے، اس طرح خطابت بھی کروٹیں لیتی ہے۔ اس کے پیرہن بدلتے ہی رہتے ہیں۔ ایک دوسری چیز خطابت کے رنگ و روغن میں مختلف قوموں اور ان کی زبانوں کا اختلاف ہے۔ ہر قوم اور ہر زبان کی خطابت میں اظہار و اسلوب کے اعتبار سے جلی و خفی فرق ہوتا ہے۔ اب بھی دنیا میں کئی ملک موجود ہیں جہاں پبلک جلسہ کا تصور ہی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ پبلک جلسہ کا تصور مغرب کی چیز ہے۔ اس برِ عظیم میں انگریزوں کی آمد کے ساتھ، پبلک جلسہ کا تصور وارد ہو کر وسعت کو پہنچا ہے۔ جس رفتار سے یورپ میں سائنسی اور صنعتی انقلاب ہوا اور مشرق کے مختلف ملکوں میں یورپ کی محکومیت نے جس طرز کے برگ و بار پیدا کیے ہیں، ان کے مطابق خطابت کا سانچہ بدلتا رہا ہے۔ خود مشرق کے بعض ممالک میں خطابت کا پیمانہ الگ ہے۔ جو ملک شعور و تعلیم سے بہرہ مند اور سیاسی اصطلاح کے مطابق ترقی یافتہ ہیں، ان کی خطابت میں اظہار کی متانت اور علم کا

ٹھہراؤ ہے اور جو ملک پسماندہ ہیں، لیکن ان کے ذہن انگڑائی لے چکے ہیں، وہ استدلال کی بہ نسبت جذبہ سے کام لیتے اور اس ذھن میں رہتے ہیں کہ وہ کیونکر تحریک کو جنم دے سکتے ہیں۔

خطابت کے فن کو سمیٹتے ہوئے، اس بارے میں کئی ایک تشریحی خطوط اُبھرتے ہیں۔ ایک دفعہ انٹرنیشنل پریس انسٹی ٹیوٹ کے صدر نے ٹوکیو میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ تقریر عورت کے لباس کی طرح مختصر ہونی چاہیے۔ ظاہر ہے کہ یہ جملہ مشرقی قوموں کے حسبِ حال نہیں۔ اس کا لطف مغربی معاشرے کے نقال ہی اُٹھا سکتے ہیں۔ مشرقی عورت اور مغربی عورت میں بہت بڑا فاصلہ ہے۔ ایک مشرقی عورت اس لباس کا تصور ہی نہیں کر سکتی جو مغربی عورت عصرانوں اور عشائیوں میں پہن کر چلی آتی اور تجریدی آرٹ کی طرح اُڑی پھرتی ہے۔ اس زمانہ میں ایک اور چیز پیدا ہوتی ہے۔ پہلے مسائل و مباحث اس قدر نہ تھے اور جذبات ہی خطاب کا محور تھے۔ اب مسائل و مباحث کا انبار لگ چکا ہے اور ان میں بہت سی پیچیدگیاں ہیں۔ یہی سبب ہے کہ لفاظ و لسان قابلِ اعتنا نہیں رہے۔ وہ پکے راگوں کی طرح سنے جاتے ہیں یا پھر انہیں سماع کی چیز سمجھا جاتا ہے۔ ادھر لوگوں کے پاس وقت نہیں رہا کہ لمبی لمبی تقریریں سنیں۔ اب اجمال میں تفصیل اور اختصار میں اظہار کا زمانہ ہے۔ ہر مجمع صاف ستھری، واضح، آشکار اور سادہ زبان کی خواہش رکھتا اور ایک فلمائی ہوئی خطابت پر ریجھتا ہے۔ عوام پسند کرتے ہیں کہ اُن کے سامنے اس طرح کی تقریر ہو گویا وہ کوئی فلم دیکھ رہے ہیں اور اس کے تمام مناظر اپنے مکمل تصور کے ساتھ نگاہوں سے نکلتے جا رہے ہیں۔

جب آپ عوام سے مخاطب ہیں تو آپ پر لازم ہے کہ بوجھل، پیچیدہ، ادق، نامانوس اور ان گڑھ الفاظ سے پرہیز کریں اور یہ چیز ذہن میں رکھیں کہ دوراز کار استعارے، پیچ و خم میں لتھڑی ہوئی تشبیہیں، معمہ نما رمزیں، ملفوف کنائے اور محصور محاورے عوام کے لیے پہیلیاں ہیں۔ ان سے مجمع من حیث الکل متمتع نہیں ہوتا اور نہ

آپ ان کی معرفت عوام کے ذہنوں میں اتر سکتے ہیں۔

ہمارے گردوپیش کا میدان خطابت کے شہسواروں سے خالی ہو چکا ہے۔ ورنہ آزادی سے پہلے برِ عظیم میں اس پائے کے خطیب گزرے ہیں کہ خطابت ان پر صدیوں فخر کرتی رہے گی۔ جب کسی ملک میں عوام کی جدوجہد کا بازار گرم ہوتا ہے تو اس کا ولولہ خطبا پیدا کرتے ہیں۔ ہماری جدوجہد کا شعلہ خطابت سے بھڑکتا تھا۔ ہم اپنی آزادی کے لیے تحریروں سے کہیں زیادہ تقریروں کے ممنون ہیں۔ افسوس کہ اپنے مقرروں کی آوازیں ہم محفوظ نہ کر سکے۔ جب آوازیں محفوظ کرنے کے آلے ایجاد ہوئے تو کسی کا ذہن اس طرف منتقل نہ ہُوا۔ بہت سے مقرر اس سے پہلے رحلت کر چکے تھے اور کئی عمر کے ساتھ تھک گئے تھے۔ اگر کچھ آوازیں محفوظ ہو سکی ہیں تو وہ ان کی خطابت نہیں، آواز ہیں۔ ان کی تقریریں نہیں، یادیں ہیں۔ مثلاً یہ بات کہ "برطانوی سامراج ہم سے کیا سلوک کر رہا ہے اور ہم اس کی غلامی سے آزادی حاصل کرنا چاہتے ہیں" تو اس کے متعلق مشتر کہ جدوجہد کے ہر مقرر کا انداز جداگانہ تھا۔ لبِ لباب وہی تھا کہ ہم برطانوی اقتدار سے بیزار ہیں اور اپنے ملک کی آزادی ہمارا پیدائشی حق ہے۔ لیکن ہر مقرر کا اسلوب و اظہار مختلف تھا۔ ایک خطیب کس انداز سے بولتا تھا۔ ایک مقرر کا اسلوب کیا تھا اور ایک قائد کی خطابت کا دھارا کیونکر بہتا ہے؟ اس کا اندازہ ایک ہی موضوع پر ان کی تقریروں کے انداز سے ہو سکتا ہے کہ رنگا رنگ کے الفاظ، اور طرح طرح کے فقرے وحدت مقصد کے باوجود کیونکر اظہار و اسلوب کی بُوقلمونی پیدا کرتے ہیں اور مختلف شخصیتوں کے ساتھ ان کا تاثر کیا ہوتا ہے۔

ایک خطیب اپنی انفرادیت ہی سے صاحبِ طرز ہوتا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے دوسری جنگِ عظیم کے دوران کانگرس کے صدر کی حیثیت سے لاہور کے ایک جلسہ عام کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:

"مسٹر چرچل انگلستان کا وزیر اعظم ہونے کی بجائے کیمبرج یا آکسفورڈ میں

تاریخ کے پروفیسر ہوتے تو گمانِ غالب تھا کہ انہیں قومی آزادی کے معنی سمجھنے میں آسانی ہوتی، وہ تاریخی تقاضوں کو محسوس کرتے اور ہندوستان کا مطالبۂ آزادی کسی تذبذب کے بغیر تسلیم کر لیتے لیکن برطانوی استعمار کا نمائندہ ہونا انہیں گمراہ کر گیا ہے۔ وہ محسوس ہی نہیں کرتے کہ ہندوستان آزادی کی منزل میں داخل ہو چکا ہے اور اب ان کے رواں قافلے کو روکا نہیں جا سکتا ہے..... ہم جانتے ہیں کہ آزادی خیرات نہیں، جو صدا دے کر حاصل کی جاتی ہے۔ آزادی ہر قوم کا حق ہے اور مسلوب ہونے کی صورت میں استقامت کی شاہراہ سے گزر کر ایثار کی طاقت سے حاصل کی جاتی ہے۔ ہم اپنی آزادی کے حصول کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ سوال یہ نہیں کہ ہم پر کیا گزرتی ہے۔ جو پیش آتا ہے، ہم اس کے لیے تیار ہیں۔ جو لوگ مقصد کے عشق میں سفر کو نکلتے ہیں، اُن کے آبلے کانٹوں سے گھبراتے نہیں۔ ان کی مدارت سے خوش ہوتے ہیں۔ وہی انسان سرخرو ہوتا ہے جو استیلاء و آزمائش میں ثابت قدم رہا اور جس کا دل اس یقین سے معمور ہو کر آگ کے شعلے، جدوجہد کی سچائی سے گلستان ہو جاتے ہیں۔

ہم نے ایک کارواں مرتب کیا اور سفر کو نکل چکے ہیں۔ اب کسی پڑاؤ پر ستانے کے لیے ہم کچھ دیر ٹھہر سکتے ہیں لیکن پاؤں توڑ کر رک نہیں سکتے۔

سیاست ایک آگ ہے جو پہلے خود بھڑکتی پھر بھڑکائی جاتی ہے۔ جس حکومت سے ہمارا واسطہ ہے، اُس کا شعار ہو گیا ہے کہ نہ تو ہمیں عزت کے ساتھ جینے دیتی ہے اور نہ عزت کے ساتھ مرنے دیتی ہے، جو ہمارے راستہ کی سب سے بڑی روک ہے۔ میں نے فیصلہ کر رکھا ہے کہ آزادی کا جو چولہا دہک رہا ہے۔ اس کے لیے ملک کے گوشہ گوشہ سے ایندھن جمع

کروں۔ پھر اپنے دامن سے ہوا دوں اور چولہے کو دہکاتا رہوں۔ آگ بھڑک رہی ہے، چولہا گرم ہے اور اب کوئی سی طاقت اپنے کسی گھمنڈ یا زعم میں ہمارے ولولوں کو سرد کرنے کی حوصلہ نہیں کر سکتی۔ ہماری صبح آزادی قریب آچکی ہے اور پو پھٹنے ہی والی ہے۔ جس اقتدار کی نمائندگی مسٹر چرچل کرتے ہیں، اُس کی شام ہو چکی ہے۔ سورج جا چکا ہے۔ دن ڈھل گیا ہے۔ یورپ کی جنگ جن عنوانوں سے لڑی جا رہی ہے، ان کے مضمرات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جنگ میں ہارنے والے اور جیتنے والے، اپنی تقدیر کے دروازے پہ کھڑے ہیں۔ دونوں مختلف عنوانوں سے ہار جائیں گے۔ اب فتح و شکست کا پرانا تصور یکسر تبدیل ہو چکا ہے۔ ہم نے آزاد ہونے کا تہیہ کر لیا ہے۔ ہمارا قافلہ اب بڑھتا ہی چلا جائے گا۔ جو قدم اٹھ چکے ہیں، وہ رک نہیں سکتے۔ صدیوں کی تاریخ ہفتوں میں گزر رہی ہے۔ مَیں دیکھ رہا ہوں کہ رات بڑی تیزی سے کٹ رہی ہے اور صبح وقت کی ایک دو کروٹوں کے ساتھ طلوع ہونے والی ہے۔ جو لوگ ہماری آزادی کو محسوس نہیں کرتے، وہ تقدیر سے لڑ رہے ہیں۔ ان کی نظریں ماضی کے غاروں میں اٹکی ہوئی ہیں۔ مسٹر چرچل نے کسی وجہ سے آنکھیں بند کر لی ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کی آنکھیں کھلیں گی تو صبح ہو گی۔ صبح اپنی آمد کے لیے کسی فرد کی بیداری کا انتظار نہیں کرتی اور نہ وقت کسی کے لیے رکتا ہے۔ کوئی سی حالت ہو، اپنے وقت پر پو پھٹتی اور صبح ہو جاتی ہے۔ یہ کہنا مشکل نہیں رہا کہ برطانوی استعمار کا رختِ سفر بندھ چکا ہے۔ ہندوستان سے اس کے اقتدار کی سانس اکھڑ چکی ہے اور اس کا استیلا جانکنی کے عالم میں ہے۔ گویا..... ع

اُس کا جانا ٹھہر گیا ہے صبح گیا یا شام گیا"

سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ برِ عظیم کی آزادی کے سوال پر خطاب کرتے تو ان کے لب و لہجہ کا اتار چڑھاؤ موسیقی کے زیر و بم کی طرح ہوتا۔ اسی زمانہ میں ایک جلسہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا......

"وہ زمانہ آ گیا ہے جس کا انتظار تھا۔ نگاہ اٹھاؤ اور دیکھو کہ جنگِ عظیم گھنگھور گھٹاؤں کی طرح سروں پر منڈلا رہی ہے۔ نہ جانے کب جل تھل ہو۔ غیب کا علم تو اللہ کو ہے وہی علام الغیوب ہے، لیکن مشیتِ ایزدی نے ظالموں کا یوم حساب قریب کر دیا ہے۔ جنگ ہو گی، ضرور ہو گی۔ یورپ کے میدانوں میں ہو گی اور اپنی ہولناک بربادیوں کے ساتھ پھیل جائے گی۔ جو چیز پردۂ غیب میں ہو، اس کے بارے میں حکم نہیں لگایا جا سکا اور نہ کوئی پیش گوئی کی جا سکتی ہے۔ علیم و خبیر ذاتِ الٰہی ہے۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جنگ کیا لائے گی اور کیا چھوڑ جائے گی۔ جن لوگوں نے پہلی جنگِ عظیم میں فتح حاصل کی اور اس کے بعد متمرّد ہو گئے، پھر نسل انسانی کو تقسیم کیا اور ملکوں کی بندر بانٹ کی۔ انہیں معلوم ہو چکا ہے کہ وہ کہاں کھڑے ہیں اور انہیں کہاں پہنچنا ہے؟ انہیں جنگ کے تھپیڑوں سے محسوس کرنا چاہیے اس زمانے میں کوئی سی قوم نہ تو غلام رکھی جا سکتی ہے اور نہ غلام رہ سکتی ہے۔ ہندوستان آزاد ہو گا۔ آئندہ جنگ کے دوران آزاد ہو گا۔ جنگ اپنے انجام کو پہنچے گی تو آزاد ہو گا۔ اب اس کی آزادی موقوف و معطل نہیں کی جا سکتی۔ قدرت اپنے فیصلے انسانوں کی خاطر نہیں بدلا کرتی۔ ہندوستان کی آزادی کا فیصلہ عرش کی رفعتوں پر ہو چکا ہے۔ جو لوگ اب بھی اپنی پیشانیوں پر وفاداری کا قشقہ لگا کر اپنی محکومی کی عمر کو طول دینا چاہتے ہیں، اس تعبد کا حق پہنچتا ہے۔ ان کا ضمیر آزادی کی لذت سے آشنا ہی نہیں۔ ان کے لیے ممکن ہے یہ سب فخر و ناز کی پونجی ہو اور وہ

اسے توشۂ آخرت خیال کرتے ہوں لیکن اب جو سفینہ ڈوبنے والا ہے، وہ ڈوب کے ہی رہے گا۔ اسے بچایا نہیں جا سکتا۔

میں نے اپنی عمر اسی جدوجہد میں گزار دی ہے۔ میں اب عمر کی اس منزل میں ہوں کہ تھک چکا ہوں میرے بالوں میں سفیدی آ گئی ہے لیکن بعض دلوں کی سیاہی ابھی تک نہیں ڈھلی۔ ان کے نزدیک ہم باغی ہیں اور وہ نہیں جانتے کہ بغاوت کیا ہوتی ہے؟ کیا اپنی آزادی کا مطالبہ کرنا بغاوت ہے؟ اور جب یہ الفاظ وہ لوگ کہتے ہیں جنہیں اپنے ہندوستانی ہونے سے انکار نہیں اور مسلمان کہلاتے ہیں تو میرا دل کھول اُٹھتا ہے۔ میرا دماغ دہکنے لگتا ہے میری زبان انگارے اُگلنا چاہتی ہے۔ میں سوچتا ہوں یہی لوگ ہیں جو اپنے ہی ایمان کی جانکنی کا تماشا دیکھتے ہیں۔ کس زبان سے کہوں کہ ان مادر زاد وناداروں نے برطانیہ کے عشق میں اپنی جانیں دے کر یا پھر حریت خواہوں کے سر اُتار کر قومی آبرو کو مجروح کیا اور حریتِ ضمیر کے چہرے پر کالک ملی ہے۔ اب وہی کالک اُن کے چہروں کو سیاہ کر چکی ہے اور آزادی کا چہرہ صبح کے سورج کی طرح دمک رہا ہے۔ انہیں سلطنت کے فرزند ہونے پر ناز ہے، ہمت ہے تو تاریخ کی رفتار روک لیں۔ تاریخ اس تیزی سے پلٹا کھا رہی ہے کہ انگریز کو ہندوستان خالی کرنا ہو گا اور ہم آزاد ہو کر رہیں گے۔ مؤذن صبح کی اذان دے چکا ہے اور اب صبح کو ملتوی نہیں کیا جا سکتا ہے"۔

مولانا ظفر علی خان، علی گڑھ کے لہجہ میں حیدر آباد کے شرفا کی زبان بولتے تھے۔ ان کے لب ولہجہ میں دہلی و لکھنؤ کا رکھ رکھاؤ تھا۔ لاہور میں پنڈت جواہر لعل نہرو کی صدارت میں ایک جلسہ تھا اور موضوع ہندوستان کی آزادی کا تھا۔ آپ نے خطاب کرتے ہوئے کہا:

"انگریز اقتدار کے نشہ میں اس بُری طرح بدمست ہیں کہ انہیں ابھی تک یہ احساس نہیں ہو رہا کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔ وہ 1936ء میں بھی ہم سے وہی سلوک کر رہا ہے جو اس نے 1857ء میں ہندوستان سے کیا تھا۔ اس کو آج 63 برس بعد بھی اس کا اندازہ نہیں ہو رہا کہ ہم کہاں پہنچ چکے ہیں۔ ہمارا کارواں سرگرم ہے۔ ہم اس مقام پر ہیں کہ اب..... ع

ٹوٹ تو سکتے ہیں لیکن ہم لچک سکتے نہیں

قدرت نے ہم میں ہمالہ کی بلندی، بحرِ ہند کی گہرائی اور گنگا و جمنا کی روانی پیدا کر دی ہے۔ ہمارا کارواں مرتب ہو چکا ہے۔ جواہر لعل سالارِ کارواں ہیں۔ حُدی خوانوں کے نغمے ہیں۔ جوانی کی امنگ و ترنگ ہے اور ہم سے ٹکرانے والے نوٹ کر لیں کہ وہ ٹکرائیں گے تو پاش پاش ہو جائیں گے۔ اپنی آزادی کے لیے ہم بے پناہ ہو گئے ہیں۔ ہم بنیانِ مرصوص ہیں۔ ہم نے اپنے اختلافات کی خلیج پاٹ دی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ طاقت اپنی جگہ خالی کرنے کے لیے طاقت چاہتی ہے۔ انگریز کا ہندوستان سے نکل جانا مقدر ہو چکا ہے۔ ہم ایک طوفان کی طرح اٹھیں گے اور اس کی سلطنت کے کرّوفر کو خس و خاشاک کی طرح بہالے جائیں گے۔ افسوس ان ٹوڈیانِ کرام اور وفادارانِ عظام پر ہے جو انگریز کے اشارۂ چشم و ابرو کی شہ پا کر مٹھی میں ہوا تھامتے اور آسمانوں میں تھگلی لگاتے ہیں۔ انہیں اس بدیہی حقیقت کا احساس ہی نہیں کہ برطانوی سلطنت ہندوستان کے لیے ایلیو ہو چکی ہے اور اس طرح محو ہو رہی ہے جس طرح صبح ہوتے ہی آنکھوں سے رات کا کاجل بہہ جاتا اور پیشانیوں سے قشقہ اتر جاتا ہے"۔

پنڈت جواہر لعل نہرو انگریزی انشا و بیان میں چابکدست تھے لیکن اس مہارتِ تامہ کے باوجود ان کی تقریر میں یہ وصف تھا کہ اردو بولتے تو ڈھلی ڈھلائی زبان ہوتی۔

بکسی فقرہ میں کوئی پیوند نہ ہوتا۔ آپ نے اس جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے ہندوستان کی آزادی سے متعلق کہا:

"ہمارے سامنے سوال یہ نہیں کہ انگریز ہماری آزادی کو تسلیم کرتے ہیں یا نہیں؟ آزادی تسلیم نہیں کی جاتی، تسلیم کروائی جاتی ہے۔ ہندوستان برطانوی سامراج کے لیے عالمی خزانہ ہے۔ جس خزانہ کو اس نے پون صدی سے چند برس پہلے اپنے استبداد کی طاقت سے حاصل کیا تھا وہ شاید اس لیے اس سے دستبردار نہیں ہو رہا کہ ہم اُس سے واپسی کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ اُس نے ہمیں طاقت سے زیر کیا تھا، ہم طاقت ہی کے بل پر اس سے ہندوستان واپس لیں گے۔ ہماری آزادی کے سلب کرنے اور ہمیں غلام رکھنے کا کسی عنوان سے اس کو کوئی حق نہیں۔ وہ سیاسی اصطلاحوں کی آڑ میں ہمیں اس حالت میں رکھنا چاہتا اور بعض اصطلاحات کے کھلونے دے کر بہلانا چاہتا ہے۔ اُن کو یہ جان لینا چاہیے کہ ہم اپنی زنجیریں توڑنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ وہ اس طرح جانا چاہتے ہیں جس طرح آئے تھے یا اس طرح نکلنا چاہتے ہیں جس طرح انقلاب کسی کو نکالتا ہے"۔

مولانا محمد علی جوہر کے لہجہ میں گونج، اظہار میں گرج اور اسلوب میں دبدبہ تھا۔ اُن کا بیان شعلہ و شبنم کا آمیختہ تھا۔ ایک تقریر میں فرمایا:

"میں نہ تو ذو معنی باتیں جانتا ہوں اور نہ مصلحت کے خلاف چڑھا کر خطاب کرنا میرا شیوہ ہے۔ بات وہی دل میں اترتی ہے جو صاف ہو، بے دلیل ہو، بامعنی ہو، سہل ہو اور سیدھی ہو۔ جس بات کے عقب میں خوف ہو یا جس سخن کے ساتھ تذبذب ہو اور لہجہ لیپاپوتی کا ہو وہ بات کسی حال میں موثر نہیں ہوتی۔ وہ سونا نہیں ملمع ہے۔ وہ کاغذ کا پھول ہے جو خوشنما ہو

سکتا ہے، خوشبو دار نہیں۔ مَیں لگی لپٹی رکھنے کا عادی نہیں۔ وہ زمانہ لد گیا جب الفاظ کے ہیر پھیر کا سہارا لیا جاتا تھا۔ اب اس طرح کہو جس طرح بادل برستے اور بجلی کڑکتی ہے۔ وہی بات اندھیروں کو چیر سکتی ہے جس میں تلوار کی کاٹ ہے۔ مَیں کھلے الفاظ میں کہتا ہوں کہ برطانیہ کو ہندوستان سے چلے جانا چاہیے۔ اُس کی حکومت ہمارے قومی شرف اور انسانی وجود کی توہین ہے۔ کوئی غیرت مند شخص اپنی توہین برداشت نہیں کرتا۔ ہندوستان للکار رہا ہے کہ برطانیہ کو اس کی دھرتی سے چلے جانا چاہیے۔ ہم فی الحال ترکِ موالات اور عدم تشدد کے شریفانہ ہتھیاروں سے ہندوستان چھوڑ دینے کا مطالبہ کر رہے ہیں جس قوم کی آزادی سلب ہو جائے اُس کو حق پہنچتا ہے کہ غاصبوں کے ساتھ ہر طرح لڑے اور جو ہتھیار اٹھانا چاہتی ہے، اٹھائے۔ اس راہ میں ہر ہتھیار جائز ہے۔ ہم نے ایک الاؤ روشن کیا ہے اور یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ ہندوستان میں حکومتِ برطانیہ دم واپسیں تک پہنچ چکی ہے"۔

نواب بہادر یار جنگ کو دیکھنے کا اور سننے کا موقع نہیں ملا۔ لیکن ان کے متعلق سیاسی حلقوں سے جو کچھ معلوم ہُوا یا اُن کے سوانح و افکار کے اختصارات میں جو کچھ دیکھا اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ اپنی خطابت کے عنفوانِ شباب میں رحلت کر گئے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں کمالِ خطابت عطا کیا تھا۔ ان کے خمستانِ سخن میں ہر طرح کے جام تھے۔ اُن کی ایک تقریر کے چند جملے ایک دوست نے روایت کیے ہیں۔ اقبالؒ کے موضوع پر تقریر کر رہے تھے۔ فرمایا:

"اقبالؒ نے ہمارے قومی تشخص کو نمایاں کیا ہے۔ ہم یورپی افکار کے اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مار رہے تھے۔ ہمارا سورج زوالِ اقتدار کے بعد گہن میں آ گیا تھا۔ ہم نے مغرب کے نظریاتی چراغوں کی روشنی ہی کو

اصل روشنی سمجھ لیا تھا۔ اقبالؒ نے ایک باطل کے مقابلہ میں دوسرے باطل کی طرفداری کرنے سے انکار کیا اور واشگاف لہجہ میں کہا کہ ہم کسی باطل کا اس لیے ساتھ نہیں دے سکتے کہ وہ جدوجہد کر رہا اور حریف باطل کو شکست دے کر اس کی جگہ لینا چاہتا ہے۔ غلطی کی جگہ غلطی لے تو اس سے تصحیح نہیں ہوتی اور نہ خرابی ہی خوبی ہو سکتی ہے۔ اقبالؒ کا ہم پر سب سے بڑا ذہنی احسان یہ ہے کہ اس نے ہمیں وطنیت و قومیت کے اُن نظریوں سے نجات دلائی ہے اور ملت کے پشتیباں کی حیثیت میں اُن کے سامنے کھڑا ہو گیا ہے جو یورپ کے سیاسی افکار کے ارتداد و الحاد کی سرگزشت ہیں۔ اقبالؒ کی فکر، ایشیائی مسلمانوں کے اضطراب کا عکس اور عالمی مسلمانوں کے التہاب کی پکار ہے۔ وہ یورپ کے ذہنی استیلا سے کسی حال میں مرعوب نہیں ہوئے اور نہ ہندوستان میں قومیت کی جدوجہد کے سامنے سپر انداز ہوئے۔ انہوں نے ہر حال میں مسلمان کی حیثیت سے سوچا اور اپنی ملت کی سوانح عمری کے خطوط جمع کرتے ہوئے اعلان کیا کہ..... ؏

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

حقیقت یہ ہے کہ اقبالؒ اپنے دور کے سب سے بڑے۔ مسلمان تھے۔ انہوں نے مغرب کی علمی قیادت کے چیلنج کو نہ صرف اس کے مفتوح ذہنوں سے خارج کیا بلکہ مسلمانوں کے ملی حدود کا تعیّن کر کے اُن کے نصب العین کو اجاگر کیا۔ ہم آج اس نصب العین ہی کے لیے سرگرم جہد ہیں"۔

سردار عبدالرب نشترؔ علی گڑھ کے فارغ التحصیل تھے۔ ان کا لہجہ منجھا ہوا تھا۔ انتہائی اعتماد سے بولتے اور بیان کے پھیلاؤ سے اجتناب کرتے تھے۔ خطابت میں مولانا

محمد علی جوہر سے فیضان پایا تھا۔ سرحد میں قائداعظم محمد علی جناح کے سفیر تھے۔ ان کا روشن اسلوب یہ تھا کہ دل آزار الفاظ سے پرہیز کرتے اور کسی عنوان سے کوئی چٹکی لیتے تو مطائبات کے حدود میں رہتے۔ ایک ادبی ذوق کے خطیب تھے۔ پاکستان کے مسئلہ پر ان کی ایک تقریر ملاحظہ ہو:

"کچھ لوگ پاکستان کے تصور کو شاعر کے خیال سے تشبیہ دیتے ہیں۔ اگر اُن کے خیال میں پاکستان فی الواقعہ شاعر کا خیال ہے تو وہ اس سے پریشان کیوں ہیں؟ اور ان کی ذہنی صعوبت کا سبب کیا ہے؟ وہ اپنے سفر میں لگے رہیں، ہمیں اپنی دُھن میں چلنے دیں۔ ظاہر ہے کہ شاعر کے خیال حقائق کی دُنیا سے تعلق نہیں رکھتے۔ اس طرح کچھ لوگ اپنے دماغ کی اُڑانوں کا سہارا لے کر پاکستان کے مؤقف کو مسلمانوں کے لیے مہلک قرار دیتے ہیں۔ حیرت کا موجب ہے کہ انہیں بھی مسلمانوں کی حیات کا احساس ہے۔ جو لوگ ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں کو ان کے حقوق دینے کے لیے تیار نہیں، وہ مسلمانوں کی بقا کا ذکر کرتے ہیں تو خامہ انگشت بدنداں اور ناطقہ سر بگریباں ہوتا ہے۔ اگر مسلمانوں نے، ان سیاسیین کے خیال میں، پاکستان کا مطالبہ کر کے اپنی ہلاکت کا راستہ اختیار کیا ہے تو ان مخلصین کو ان کی فکر نہ کرنی چاہیے۔ ہم ایک عظیم ماضی کے وارث ہیں اور ہمارے سامنے تاریخی تجربوں کا انبار ہے۔ ہمارا حال ان تجربوں سے ابھر رہا ہے اور ہم نے اپنی شاہراہ ڈھونڈلی ہے۔ رہا یہ سوال کہ ہم نے جو قدم اٹھائے ہیں وہ ہمیں کس مستقبل کی طرف لے جارہے ہیں، ہماری منزل کہاں ہے؟ تو میں اپنے ان سیاسی مشیروں اور قومی نقادوں سے کہوں گا کہ وہ ہماری فکر نہ کریں۔ ہم جینے اور مرنے کی راہوں سے آشنا ہیں۔ ہم نے پہاڑوں کی بلندیوں پر اپنے علم گاڑے ہیں۔ دھرتی کے سینوں کو چیرا ہے

اور سمندروں کے عمق سے موتی نکالے ہیں۔ اب یہ ممکن ہے کہ سورج مشرق کی بجائے مغرب سے طلوع ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ صبح و شام اپنی رفتار بدل لیں اور وقت کچھ دیر کے لیے ٹھہر جائے لیکن جو قافلہ قائد اعظم کی راہنمائی میں رواں ہو چکا ہے، وہ اب منزلِ مقصود پر پہنچ کر ہی دم لے گا اور دُنیا جان لے گی کہ حق کا سورج کیوں کر طلوع ہوتا ہے"۔

ڈاکٹر سیف الدین کچلو معرکہ آرا خطیب تھے۔ لیکن ان کی زبان میں شیرینی اور ان کے بیان میں سنگینی کا پرتو تھا۔ وہ برطانوی استعمار کے خلاف جدّوجہد کے ابتدائی دور میں جلیانوالہ باغ امرتسر کے ہیرو تھے۔ انہیں الفاظ و مطالب دونوں پر قابو تھا۔ ان کے الفاظ دل سے دھڑک کے نکلتے اور پھڑک کے پھیل جاتے تھے۔ ان کی تقاریر اس انداز سے ہوتی تھیں:

1) "مسلمان اور غلامی ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔ ہم نے کبھی دو ضدوں کو اس طرح جمع ہوتے نہیں دیکھا جس طرح ہندوستان کا مسلمان غیر ملکی غلامی سے چپک کے رہ گیا ہے"۔

2) "بزدل اور بہادر کی یہی پہچان ہے کہ بزدل زندگی ہی میں مر جاتا ہے اور بہادر مر کے بھی زندہ رہتا ہے۔ جن لوگوں نے حریتِ ضمیر کے لیے جانیں دی ہیں، وہ جانتے ہیں کہ بہادر کی موت زندگی کی ابتدا ہے"۔

3) "تاریخ کبھی بادشاہوں کے تذکرے کا نام تھا۔ اب تاریخ انسانوں کی سرگزشت اور قوموں کی جدّوجہد کا نام ہے۔ اب اس کے دامن میں وہ سب کچھ ہے جو اس سے پہلے تاریخ کے سان گمان میں نہ تھا۔ اب محلوں کی رُوداد قلم کی نوک سے ہٹ کر نیزہ کی نوک پر آچکی ہے۔ وہ دور بیت گیا، جب محلوں کے نغمے محفوظ کیے جاتے تھے۔ اب جھونپڑوں کے نوحے تاریخ کا حصّہ ہیں"۔

4) "میں نوجوانوں سے کہتا ہوں، آگے بڑھو یا وقت کی رفتار روک لو۔ وہ جوانی

میرے نزدیک عناصر اربعہ کا کفن ہے جس میں مقصد کی تب و تاب اور آزادی کا ولولہ و عشق نہیں۔ جس قوم سے راستباز زبانیں اٹھ جائیں، وہ قوم گورِ غریباں ہو کر رہ جاتی اور اس کا شعلۂ احساس چتا کی راکھ ہو جاتا ہے"۔

ہم ابھی آزاد نہیں ہوئے تھے تو ہندوستان کی مشترکہ فضا میں بہت سے مقرر ذہنوں پر جادو کرتے تھے۔ مثلاً ڈاکٹر محمد اشرف علی گڑھ کے طالب علم اور استاد رہ چکے تھے اُن کی خطابت میں آبشار کا بہاؤ تھا۔ اُن کے لہجہ میں نسیم خوشگوار کی غنچہ کشائی کا تموّج تھا۔ انہیں کانگرس کا سٹیج ملا۔ پھر کمیونسٹ پارٹی میں چلے گئے۔ آزادی کے چند سال بعد جوانی و کہولت کی سرحد پر انتقال کر گئے۔ ان کی ناگہانی موت سے اُردو ایک زبردست خطیب سے محروم ہو گئی۔ وہ کچھ اس طرح بولتے تھے:

"آپ برائی اور اچھائی کی پہچان پیدا کریں اور دانائی و بینائی سے کام لیں۔ آج کا انسان قبل از مسیح کا انسان نہیں۔ وہ دھات اور پتھر کے زمانہ سے بہت آگے نکل چکا ہے۔ اب علم کی وسعتوں نے کرۂ ارضی کے انسان کو ایک دوسرے سے جوڑ دیا ہے۔ وہ زمانہ نہیں رہا جب انسان اپنے ہی ملک میں اجنبی تھا یا اُس پر سرکش انسان مار دھاڑ سے حکمران ہو جاتے تھے۔ آج کے انسان کا شعور جاگ اُٹھا ہے۔ وہ جغرافیائی حدوں کی تقسیم کے باوجود عالمی انسان ہے۔ اُس کی حکمرانی کے سانچے عالمی نہ سہی لیکن اُس کے فکری سانچے بہر حال عالمی ہیں۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ اب بھی بعض ملکوں کے پاؤں میں غلامی کی زنجیریں ہیں۔ ہم خود سفید فام استعمار کے غلام ہیں اور یہ بھی واضح و آشکار ہے کہ بعض ملکوں کے عوام کو ان کی بادشاہتوں اور ان کی سرداریوں نے استحصال کے مختلف خانوں میں تقسیم کر کے اپنی جنس بنا رکھا ہے۔ لیکن یہ دور اب زیادہ دیر نہیں رہ سکتا۔ یہ رات بہت جلد صبح کی آغوش میں آ جائے گی۔ سب سے بڑا انقلاب یہ ہے

کہ انسان نے طبقاتی کشمکش کا راز پالیا ہے اور اب سرمایہ و محنت کی جنگ ہی سے نظامِ نو کا ناد پھونکا جائے گا۔ اب شاہوں کی حکمرانی کا دور گزر چکا ہے۔ اب انسانوں کی سلطانی کا زمانہ ہے"۔

مولانا احمد سعید دہلوی ٹکسالی زبان کے سب سے بڑے خطیب تھے۔ انہیں بولی ٹھولی میں کمال حاصل تھا۔ ان کے الفاظ قند پارے ہوتے تھے اور جملے دہلی کا سولہ سنگار! سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی طرح مجمع کو لوٹ لیتے۔ مجمع سنتا، سر دھنتا، سامعین کی زبانیں واہ اور آہ کے ڈونگرے برساتیں۔ مسلمانوں کو جس دہلی پر ناز تھا اس کا انجر پنجر 1857ء میں ہل گیا لیکن احمد سعید، لال قلعہ کے سامنے اردو پارک میں الفاظ و معانی کا مینا بازار لگاتے۔ حاضرین وجد و سرور میں ڈوب جاتے۔ سیرۃ النبی سے متعلق ان کی ایک تقریر کے جملے ملاحظہ فرمایئے:

1) حضور ﷺ فداہ اُمّی و ابی کے صدقہ ہی میں اس دور کی مہذب دنیا اسلام کی خوشہ چین ہو گئی تاریخ اٹھایئے۔ ورق کھولیے، نگاہ ڈالیے اور سوچیے کہ..... ع

اک عرب نے آدمی کا بول بالا کر دیا

کفر نے خوانِ اسلام کی خوشہ چینی کی اور ہم سے بعض دوائر میں آگے نکل گیا۔ ہم نے حضور ﷺ کا دین چھوڑا اور عجمی خرافات میں کھو گئے۔ پھر ہم پہ کیا بیتی کہ ہم اسی سانحہ سی کا شکار ہو گئے جو ایک قینچی کی طرح ہمارے بال و پر کاٹ چکی ہے۔ کبھی ہماری پرواز کے لیے بہت سے افق تھے۔ اب ہم اپنے ہی افق میں پرواز کرنے سے قاصر ہیں"۔

2) ہم نے کبھی سوچا کہ ہم کہاں سے چلے تھے، کہاں کہاں پھرے اور کہاں آکر ٹھہر گئے ہیں۔ اگر ستانے کے لیے ٹھہرتے تو کچھ مضائقہ نہ تھا لیکن ہم نے گنبدِ خضریٰ سے طوطا چشمی کی آستانۂ رسالت سے انحراف کیا۔ اپنے بُت ڈھال لیے، نتیجہ معلوم کہ ہم غبار کی طرح بیٹھ گئے۔ ایک زمانہ تھا کہ ہم وقت کی ناؤ کے

کھیون ہار تھے، اب عارضوں کا یہ حال ہے کہ

پاؤں توڑ کے بیٹھے ہیں پائے بند ترے

ہم اپنی تقدیر سے خود آنکھیں پھیر چکے ہیں۔ ہماری ناؤ ہچکولوں کی پکڑ میں ہے۔ بادباں ٹوٹ چکا ہے۔ کبھی ہمارے بازو، چپّو اور ہمارے قدم لنگر تھے۔ اب ہاتھ پھیلاتے ہیں تو چپّو نہیں ملتے۔ ہم پانی کی لہروں کے سفینہ پر سوار ہیں۔ ہمارا وجود اس کے لیے بوجھ ہے۔ سفینہ کہتا ہے کیا تم ان کے وارث ہو۔ جو کناروں پہ پہنچ کر عشق مقصد کی دُھن میں اپنے سفینے ڈبو دیتے تھے۔ اور سفینے ناز کرتے تھے کہ ہم نے معراج پائی ہے۔ اس طرح اللہ کے سپاہی محمد ﷺ کا پھریرا لے کر ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست کا جلوہ دکھاتے تھے۔ جب سے ہم نے انہیں چھوڑا ہے، ساری کائنات نے ہمیں چھوڑ دیا ہے۔ اس کی اطاعت کے بغیر ہمارے لیے کوئی عزت نہیں"۔

ان حوالوں سے معلوم ہو سکتا ہے کہ سلاست کیا ہے اور اس کے مربوط عناصر کس بنیاد پر اٹھائے جاتے ہیں۔ ان حوالوں سے متعلق یہ وضاحت ضروری ہے کہ بعض خطبا کے حوالے اپنی پرانی یادداشتوں یا حافظہ کی تختی سے نقل کیے ہیں۔ ایک آدھ روایت حاصل کی ہے۔ غرض ان مقرروں ہی کی تقاریر کے دو ایک پیرے نقل کیے ہیں جو اُردو زُبان کے نامور خطیب تھے۔ بعض کے ساتھ برطانوی استبداد سے لڑائی کے زمانہ میں یکجائی کا موقع ملا۔ کئی ایک کی خطابت سے فیضان حاصل کیا۔ ان حوالوں کا نقل کرنے سے مقصود یہ ہے کہ جنہیں خطابت کی تحصیل کا شوق ہے وہ جان سکیں کہ خطابت میں خیال و لفظ اور اظہار و اسلوب کے باہمی رشتے کیا ہیں اور زُبان و بیان کے سبو کیونکر بھرے جاتے ہیں۔ پھر کس قسم کے الفاظ ہم آہنگ ہوتے اور ان کے استعمال کی فضا کیا ہوتی ہے۔ جن مقرروں کے حوالے آئے ہیں۔ ان کی خطابت کا خلاصہ یہ ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد میں علم کا وقار، مطالب کا عمق اور خطابت کا دبدبہ

تھا۔ وہ دماغوں کو مسخر کرتے تھے۔ سیّد عطاء اللہ شاہ اُپی تلوار تھے۔ ان میں آواز کا جلال اور لہجہ کا جمال تھا۔ محمد علی جوہر بے پناہ تھے۔ ان کی طلاقتِ لسانی میں آہو چشموں کی شوخیاں تھیں۔ مولانا احمد سعید دہلوی اُداس راتوں میں بادِ صبحگاہی کا رجز تھے۔ سردار عبدالرب نشترؔ میں غنچہ نورسیدہ کی چٹک تھی۔ جواہر لعل کے لہجہ میں پریاگ کا حُسن تھا۔ مولانا ظفر علی خاں اُردو میں حجازی نغمہ تھے۔ نواب بہادر یار جنگ بروایت اُردو کی نیام میں عربی تلوار تھے۔ ڈاکٹر سیف الدین کچلو ضیغم کی للکار تھے۔ ڈاکٹر اشرف عید کے چاند کی طرح طلوع ہو کر دیوالی کے دیپ کی طرح بجھ گئے۔

خطابت دو واسطوں سے جوان ہوتی ہے:

1) تحریک کی فضا میں جب کسی استبداد یا استیلاء سے عوام کی ٹکر ہو۔

2) مجمع کی بھرپور تحسین سے جو مقرر کے اشہب خیالات کو رواں کرتی اور اس کا اسپ خیال بحر ظلمات کو پار کر جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ خطیب ڈھالے نہیں جاتے، وہ ڈھلتے ہیں۔ یہی ایک فن ہے جس کی سانچ کو آنچ نہیں۔ اس کی فتح مندیاں طلاقتِ لسانی سے ہیں، سپاہ کی تیغ رانی سے نہیں اور نہ اس کے ساتھ انسانی ہلاکت و تباہی اور جغرافیائی تاخت و تاراج کا زیاں ہے۔

نکات واشارات

خطابت کے لوازم کا خلاصہ یہ ہے کہ:

1) آواز کو نشوو نما دو، صاف رکھو، مستحکم کرو اور اس طرح بناؤ کہ مترنم محسوس ہو۔ یعنی اس میں ایک طرح کی نغمگی ہو، کھردراپن نہ ہو۔ ایک طاقتور آواز ہی فتح مند ہو سکتی ہے۔ آواز کو بے عیب رکھنے کے لیے اُن چیزوں کے کھانے پینے سے پرہیز کرو جن سے آواز مجروح ہوتی اور اس میں جھول پیدا ہوتا ہے۔ جو لوگ تمباکو پیتے ہیں، اُن کی آواز داغدار ہو جاتی ہے۔ اسی طرح دوسرے نشے بھی آواز کو جھریا دیتے ہیں

2) کبھی چبا کر نہ بولو۔ الفاظ نوالہ نہیں۔ اس طرح بولو کہ حلق سے نکلی، حلق میں پہنچی۔ آواز ذریعۂ ابلاغ ہے۔ گلا صاف ہو گا تو آواز ستھری ہو گی۔

3) آواز میں چمک ہو۔ اس کے زیروبم سے آشنا ہو۔ پہلے گونج اور گرج سیکھی جاتی ہے۔ پھر آواز کا اتار چڑھاؤ، خطابت کا فطری لازمہ ہو جاتا ہے۔

4) آواز میں گفتگو سے نکھار پیدا ہوتا ہے۔ ہم دوستانہ صحبتوں، عالمانہ محفلوں اور ادیبانہ حلقوں میں گفتگو سے آواز کی تربیت کر سکتے اور اس کو ترتیب دے سکتے ہیں۔

5) ہمیشہ خطباو ادبا، شعرا و حکما اور علما و فضلا کی بات چیت پر نگاہ رکھو۔ آپ ان سے بہت کچھ حاصل کر سکتے ہیں۔

6) صبح و شام کی سیر میں کھلی ہوا، آپ کی آواز کو پروان چڑھا سکتی ہے۔ تقریر سے چھ

گھنٹہ پہلے کھانا نہ کھایئے۔ موسم کے مطابق مشروب لے لیجیے۔ مثلاً دودھ پی لیں۔ چائے نوش کریں اس کے ساتھ کوئی ہلکی سی چیز کھالیں۔ پیٹ بھر کے تقریر کرنا آواز کو بوجھل کرتا اور طبیعت گراں ہو جاتی ہے۔

7) ایک بنیادی چیز اظہار ہے کہ آپ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں وہ کس طرح کہتے ہیں۔ اظہار ایک ایسا وصف ہے جو ردو قبول کی فضا پیدا کرتا ہے۔ آپ کے اظہار میں دل آویزی نہیں تو آپ کی عمدہ سے عمدہ بات بھی غیر مؤثر ہو گی۔ آپ نے کئی دفعہ محسوس کیا ہو گا کہ ایک ہی بات مختلف زبانوں سے اظہار کی بدولت، مختلف تاثر پیدا کرتی اور اظہار کی مختلف لہروں سے گرم، سرد، مرطوب اور معتدل ہو جاتی ہے۔ جب تک آپ اظہار میں دستگاہ حاصل نہ کر لیں، اس وقت تک آپ کا تاثر گہرا نہیں ہو سکتا اور نہ خطابت کا روپ ہی نکھر سکتا ہے۔

8) اظہار آواز کی اُمنگ اور لہجہ کی ترنگ ہے۔ آپ جید مقرروں اور منفرد شاعروں کو سُن کر اظہار کی آب و تاب معلوم کر سکتے ہیں اور اس کے لیے کوئی مشکل نہیں۔ آپ کے مطالعہ کی وسعتیں آواز سے مفاہمت کے بعد اظہار کو پیدا کرتی ہیں اور اظہار آپ کے خطاب کی فطرت ہو جاتا ہے۔

9) ہمیشہ دوسروں کے اظہار پر نگاہ رکھیں۔ اس مطالعہ و مشاہدہ ہی سے خطابی تجربہ اپنے لیے اظہار پیدا کرتا ہے۔

10) ہم اپنے قرأت خانے میں کتابوں کے مطالعہ سے اظہار کی نعمت پا سکتے ہیں کیونکہ تنہائی میں آواز کی مشق نسبتاً معنی آور ہوتی ہے۔

11) اشارات، خیالات کے ترجمان ہیں۔ ہم زبان سے الفاظ بولتے اور ہاتھوں کی حرکت سے ان کا وزن قائم کرتے ہیں۔ ہمارے چہرے کی سلوٹیں، بانہوں کے زاویے اور آنکھوں کے ڈورے، ہماری خطابت کا اعلامیہ ہیں۔ عوام ان سے الفاظ ہی کی طرح مستفید ہوتے ہیں۔

12) اشارات حقیقی ہوں، مصنوعی نہ ہوں۔ ورنہ تقریر کا تاثر تاراج ہو جاتا ہے۔ اشارات خیالات کی تائیدی سپاہ ہیں۔ ان سے خطابت کے مزاج کا اندازہ ہوتا ہے۔

13) آپ جس موضوع، عنوان یا مضمون پر تقریر کرنا چاہتے ہیں، اس کی تیاری ضرور کیجیے۔ کسی کاغذ کے پرزے پر اشاراتی نوٹ لینا عیب نہیں۔ ذہنی تیاری ضرور کیجیے، تیاری وزن بڑھاتی ہے جو کچھ آپ کے ذہن میں ہوتا ہے اس میں اضافہ کا موجب ہوتی اور زبان و بیان میں تسلسل و آرائش کا باعث بن جاتی ہے۔

14) ہر وہ کتاب جو آپ مطالعہ کے لیے آپ منتخب کرتے ہیں اور اس کے مصنف و موضوع یا مؤلف و مضمون کے متعلق آپ کو اعتماد ہے تو اس کے نوٹ ضرور لیجیے۔ اس غرض سے ایک کاپی رکھیے۔ اس کے نوٹوں اور خوبصورت جملوں کو دہراتے رہیے تاکہ حافظہ کا حصہ ہو جائیں اور دماغ انھیں محفوظ کرے۔

15) جس کو تحریر و تقریر پہ قدرت ہو وہ اظہار و اسلوب کے اعتبار سے منفرد خطیب ہوتا اور اس کے زبان و بیان کا آمیختہ الفاظ و مطالب میں ہمہمہ پیدا کرتا ہے۔ اس کے خیالات عمامے کی طرح بندھے ہوتے اور ان سے طرۂ گفتار میں کوئی خم پیدا نہیں ہوتا۔ جو تاثرات مطالعہ کے دوران پیدا ہوں، ان کی افادیت کے پیش نظر اپنی نوٹ بک میں ضرور قلم بند کریں۔ ان سے خطابت کی زیبائش بڑھتی ہے۔

16) جس موضوع یا مضمون پر تیاری کریں اس کے عمومی دلائل کو اپنے لہجہ میں بیان کریں لیکن اصل خوبی یہ ہے کہ اپنے موضوع و مضمون کے لیے کوئی نئی بات ضرور پیدا کریں۔

17) ایسے کسی موضوع پر کبھی نہ بولیں جس سے آپ کو دلچسپی نہیں یا جس کے بارے میں آپ کو علم نہیں۔ محض طلاقتِ لسانی سے آپ کسی موضوع یا مضمون پر قادر

نہیں ہو سکتے۔

18) ہر تقریر کے پس منظر میں خطیب خود ہوتا ہے اور شخصی تجربہ ہی تقریر کو موثر کرتا ہے۔ جب تک مقرر خود اپنے موضوع و مضمون سے مطمئن نہ ہو سلاستِ گفتار سے عوام کے دل میں نہیں اتر سکتا اور نہ انہیں مطمئن کر سکتا ہے۔ ہم انار چھوڑ کر چاندنی پیدا نہیں کر سکتے اور نہ پٹاخے چلا کر نغمہ زار اُٹھا سکتے ہیں۔

19) سب سے اہم چیز یہ ہے کہ آپ تقریر کیسے شروع کریں۔ یاد رکھیے کہ ہر تقریر کا ابتدائیہ ہی سمع و بصر کو ملتفت کرتا ہے۔ ابتدائیہ کے بول اسی طرح اُٹھائیے کہ اس کے الفاظ عوام کے سینہ میں اس طرح کھب جائیں جس طرح شاعروں کے دل میں سرمئی نگاہیں ترازو ہو جاتی ہیں۔ آپ سٹیج پر کھڑے ہوتے ہی اسی طرح معلوم ہوں کہ آپ کو خود پر اعتماد ہے۔ آپ خوش چہرہ ہیں اور عوام کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہمکلام ہونا چاہتے ہیں۔

20) ابتداہی میں گرج گونج پیدا نہ کیجیے۔ نہ آواز میں خروش و جوش لائیے۔ ملائمت و سلاست سے چلیے۔ جب لوگ ہمہ تن گوش ہو جائیں تو اظہار و اسلوب کے زاویے اپنی حرارت خود قائم کریں گے۔ آپ کے ذہن میں یہ احساس رہنا چاہیے کہ آپ لوگوں کو نہ تو فریب دینے کے لیے آئے ہیں اور نہ انہیں مغلوب کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کا مقصد ان کے دماغوں پر فتح مندی حاصل کرنا ہے۔

21) آپ کی تقریر آپ کا تعارف ہے۔ آپ کا تعارف آپ کی تقریر نہیں۔ آپ کے خیالات ہی مجمع کی ضرورت ہیں اور ان کے لیے جام و سبو سے اپنی تشنگی مٹانے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔

22) ہمیشہ اور ہر جگہ تقریر کے ابتدائیہ اُس وقت کے رواں دواں خیالات کے مطابق رکھیے اس سے کئی چیزیں حاصل ہوتی ہیں۔ مثلاً عوام کی توجہ اور طبائع کی شگفتگی۔ ان سے خیالات کی گرہیں خود بخود کھلتی چلی جاتی ہیں۔

23) ہر مقرر کے لیے پہلی چیز یہ ہے کہ وہ پہلی جست ہی میں عوام کو اس طرح اپنے ہاتھ میں لے کہ وہ اسی کے ہو جائیں۔ اور محسوس کریں کہ اُن کا دامن سماعت بھرا جا رہا ہے۔ وہ کچھ حاصل کرنے کے لیے آئے اور حاصل کر رہے ہیں۔

24) آپ مجمع کو اس وقت تک کسی ترغیب پر آمادہ نہ کریں یا عمل کی دعوت نہ دیں، جب تک اس کو وحدت میں ڈھال کر اپنی مٹھی میں نہ کر لیں۔ عوام کبھی ایک نہیں ہوتے، انہیں ایک کرنا ہی مقرر کا سب سے بڑا سحر ہے۔

25) ہمیشہ دوستانہ طریق سے خطاب کرو۔ کبھی اجنبی انداز میں نہ بولو۔ اس غرض سے ایسا کوئی پہلو ضرور تلاش کرو جو آپ کے اور عوام کے مابین مشترک ہے۔

26) اگر کوئی مقرر آپ سے پہلے اپنے خیالات کی چھاپ لگا چکا ہے اور مجمع نے اس کی تحسین کی ہے تو اپنی تقریر کا آغاز اس سے ملا کر اس طرح کیجیے، گویا آپ اس کہانی کو آگے بڑھا رہے ہیں۔

27) ہر موضوع کے حقائق ریڑھ کی ہڈی ہیں ان کے بغیر خطابت میں طاقت پیدا نہیں ہوتی اور نہ عوام ذہنی طور پر کچھ حاصل کرتے ہیں۔ ان کے سامنے حقائق کو اس طرح پیش کرو کہ ان کے دل میں اترتے جائیں۔

28) خطابت عوام کی عقلیں سلب کرنے کا نام نہیں۔ ان کی عقلوں کو اجالنے کا فن ہے۔ حقائق کو اس طرح ترتیب دو کہ مروارید کی لڑیاں معلوم ہوں۔ عوام انہیں پھولوں کی طرح چن لیں اور اُن سے سماعت کا سبد بھریں۔ جب حقائق اظہار و اسلوب کی شاہراہ سے خطابت کے زیر و بم کی معرفت اپنی معراج کو پہنچتے ہیں تو وہ آپ کی ذہنی فتح مندی کا ایک موڑ ہوتا ہے۔ اس منزل کو طلمانہ مقام کہتے ہیں۔ یہی چیز شاعری میں بیت الغزل کہلاتی ہے۔

29) یہ تقریر کی ایک معراج ہے۔ علو سے کوئی تقریر خالی نہیں ہوتی لیکن موضوع و تقریب کی رعایت سے علو کا تناسب ہوتا اور اسی کے مطابق مدو جزر کے

دھارے پیدا ہوتے ہیں۔

30) خواہ مخواہ خطابت میں تموّج پیدا نہ کیجیے۔ مصنوعی مدوجزر اور اختیاری گونج گرج کی مثال اس طرح ہے گویا آپ خواہ مخواہ ڈھولک پہ تھاپ لگا رہے اور بلا ذوق بانسری بجا رہے ہیں۔

31) خطابت میں قدرتِ تامہ حاصل کیے بغیر ایسی بات نہ کہو جس سے ٹکراؤ پیدا ہوتا، ذہن متصادم ہوتا اور فضا متحارب ہوتی ہے۔

32) خطابت کا اصل حُسن یہ ہے کہ زہر کو بھی اس طرح پیش کریں کہ وہ ذہن و سمع کے لیے شیریں ہو۔

33) بعض مقرر سامعین کی ذہنی فضا کا لحاظ نہیں کرتے اور اپنی سی کہے جاتے ہیں۔ اس طرح تقریر کامیاب نہیں ہوتی۔ اگر لوگ سُن لیں تو اس کا سبب تقریر کی دلکشی نہیں بلکہ کوئی دوسری وجہ ہے۔ مثلاً آپ کی شخصیت، جلسہ کا احترام یا عوام کا رکھ رکھاؤ، اس قسم کی تقریریں مختصر ہو سکتی ہیں، طویل نہیں ہوتیں۔ حاضرین کئی طرح کی آوازیں یا قہقہوں سے خطِ تنسیخ کھینچ دیتے ہیں۔

34) ہر ذہین خطیب کو اندازہ ہوتا ہے کہ عوام کی داد کیا ہے۔ تحسین کیا ہے اور تہنیت کیا ہے۔ اور جب عوام کسی مقرر سے اکتا جائے اور محسوس کرتے ہیں کہ وہ خطابت کی پٹڑی سے اتر گیا ہے تو کیونکر اس کی تضحیک کرتے، تب جزاک اللہ یا سبحان اللہ کا خطاب کیا ہوتا ہے۔ جب مقرر کا بیان لڑکھڑانے لگتا ہے تو عوام خندہ آور تالیاں پیٹ کر مقرر کو تشریف فرمایئے کی ترغیب و تلقین کرتے ہیں۔ ایک اچھا مقرر ستائش و تضحیک کے اشارات و کلمات کو فوراً بھانپ لیتا ہے۔

35) خطیب کی واحد خوبی یہ ہے کہ اپنے سامعین میں اکتاہٹ پیدا نہ ہونے دے اور جب اکتاہٹ پیدا ہونے لگے تو اپنے بیان میں اس طرح شگفتگی پیدا کرے کہ ان کے چہرے کھل جائیں اور ان کی توجہ ابھر آئے۔ یہی خطابت کی رعنائی ہے۔

36) بعض مقرر شعروں کی بھر مار کرتے ہیں۔ مَیں خود اپنے ابتدائی دور میں شاعری سے پورا پورا فائدہ اٹھاتا رہا۔ مری تقریر کا ایک تہائی شاعری ہوتا۔ ایک ایسا معاشرہ یا مجمع جو علمی طور پر ادھورا ہو، اس میں شاعری کی برکھا واقعی لطف دے جاتی ہے۔ لیکن شاعری کی بہتات ہر موضوع اور مضمون کے لیے موزوں نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ شعر سے خطابت میں کشش پیدا ہوتی ہے اور سامعین برجستہ اشعار پر جھومتے ہیں لیکن خطابت میں وہی شعر جوبن پیدا کرتا اور دلوں کو غنچوں کی طرح کھلاتا ہے جو تقریر سے اسی طرح منسلک ہو جس طرح ردیف کے ساتھ قافیہ اور محسوس یہ ہو گویا کسی آہو چشم کا سحر نگاہ کاجل سے دہک اٹھا ہے۔ کسی خوبصورت جملہ کے ساتھ ایک برجستہ شعر انگشتری میں نگینے کی طرح ہے۔ کسی شعر کو اس لیے استعمال نہ کیجیے کہ آپ نے استعمال کرنے کے لیے سوچ رکھا ہے جس طرح شعر خود بخود ہوتے ہیں، اسی طرح ان کا استعمال بھی بداہۃً ہو۔ گویا حافظہ جاگ اٹھا ہے اور فقروں کی تراش خراش کے ساتھ شعروں کا دریچہ کھل گیا ہے۔ خطابت میں شعر، آورد سے نہیں، آمد سے تیر و نشتر ہوتے ہیں۔

37) غیر ضروری لطائف، بوجھل حکایتیں اور بے ربط چٹکیاں، خطابت کے فطری حُسن کو مجروح کرتی ہیں۔ اُن سے سماعت کی یکجہتی میں دراڑ پیدا ہوتی اور خصائص خطابت میں توازن نہیں رہتا۔ مطائبات سے فائدہ اٹھائیے۔ حکایت، خطابت کی ہمجولی ہے اور طنز، پھبتی، ضلع جگت کی معرفت نہایت عمدگی سے چٹکی لی جاسکتی ہے لیکن تقریر ان کا ملغوبہ نہیں۔ ان کی حیثیت خطابت کے دریا میں کناروں کے پاس سے گزرتی ہوئی لہر کی ہے۔

38) خطابت کے لیے یبوست مہلک ہے۔ خشک لہجہ اور روکھا چہرہ کبھی مؤثر نہیں ہوتے اور نہ ان سے ذہنی فصل کاشت ہوسکتی ہے۔ جس طرح سنجیدگی کے معنی

خشکی نہیں۔ اسی طرح شگفتگی کا مطلب مسخرہ پن نہیں۔ ایک باغ و بہار طبیعت ہی باغ و بہار فضا پیدا کر سکتی ہے۔ مطائبات اور تمثیلات، خطابت کا لازمہ ہیں۔ ان میں عوام کے لیے ایک ذائقہ ہے اور وہ ان سے لذت یاب ہوتے ہیں۔ ان کی مثال کھانے کے ساتھ شیرینی کی ہے۔

39) اپنے تخیل کی اڑانوں میں اضافہ کرتے رہیے اور ان کی نشوونما اس طرح کیجیے کہ آپ خود محسوس کریں کہ آپ کوئی نئی چیز حاصل کر رہے اور آپ کے سامعین کو بھی احساس ہو کہ وہ خیالات کے نئے لالہ زاروں میں گلگشت کر رہے ہیں۔

40) زبان سیکھتے رہیے۔ زبان سب سے بڑی دولت ہے۔ جس طرح اندھا بتا نہیں سکتا کہ اس کے گرد و پیش کیا ہے۔ اس طرح زبان سے محروم انسان اپنے خیالات پر روشنی نہیں ڈال سکتا۔ ایک بے زبان شخص علم کا مزار ہے۔ زبان ہمیشہ سیکھیے، ہر لحظہ سیکھیے اور آخر تک سیکھیے۔ کیونکہ زبان انسانوں کی طرح بڑھتی، پھولتی اور پھیلتی ہے اور الفاظ نسلِ انسانی کے مانند پیدا ہوتے، پھر اپنی مختلف وادیاں گزار کر جوان ہوتے ہیں۔ کئی الفاظ زندہ رہتے، کئی الفاظ مر جاتے ہیں خود ہماری زندگی میں زبان نے اپنے کئی زاویے بدلے ہیں۔ آج وہ زبان نہیں رہی جو 1914ء میں ابوالکلامؒ اور محمد علیؒ بولتے تھے۔ وہ دور لد گیا جس کے خطیب نذیر احمد اور شبلی نعمانی تھے۔ اُردو نثر کے مختلف ادوار کا مطالعہ اُن تبدیلیوں سے آشنا کر سکتا ہے کہ ہم کہاں سے چلے تھے اور کہاں پہنچے ہیں۔ اب وہ زبان کہاں جو قلعہ معلّٰے سے منسوب تھی۔ اور وہ روزمرہ یا محاورہ کدھر جس سے دہلی و لکھنؤ مالا مال تھے۔ اُس خوبصورت زبان کی بھنک تو ہمارے کانوں میں پڑتی ہے لیکن وہ زبان اب کچھ خاندانوں کی روایت ہو کر رہ گئی ہے۔ ہم اسے پاکستان کے عوام کی زبان نہیں کہہ سکتے۔ پاکستان کی آبادی حتیٰ کہ عمومی اصطلاح کے مطابق شرفا کے گھرانے بھی انہیں عوام میں نافذ کرنے پر قادر

نہیں۔ آج کی اُردو، کل کی اُردو سے مختلف ہے اور ہم اس انقلاب کا اپنی خواہش کے مطابق یا اپنی خواہش کے خلاف مشاہدہ کر رہے ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم مبتدیوں کی زُبان اپنالیں یا غلط تجربوں سے گمراہ ہوں۔

اُردو قومی زُبان کی حیثیت سے زندہ ہے اور اس کے نشو و بلوغ کا زمانہ ہے۔ کوئی چیز متروک ہوئی ہے تو وہ ان محاوروں اور لفظوں کا ارتحال ہے۔ جو گنگا و جمنا کے میدانوں میں قصباتی و دیہاتی بولی ٹھولی سے منسوب تھے اور جن کا استعمال تھا۔ اس وضع کے الفاظ، اپنی ادبی وجاہت کے علی الرغم، جوش ملیح آبادی بول سکتے ہیں اور احسان دانش لکھ سکتے ہیں لیکن شورش کاشمیری یا عبدالعزیز خالد ملیح آباد اور کاندھلہ کے پابند نہیں اور نہ ان نقصانات کے یارانِ سرپل کا محاورہ اور روزمرہ ان کے لیے حجت ہو سکتا، یا سند کہلا سکتا ہے۔ جہاں تک زُبان کا تعلق ہے، اب بھی انہی لوگوں کی زُبان سند ہو سکتی ہے جو مرحوم ماضی میں دہلی و لکھنؤ کے دبستانِ ادب کے گوہر شب چراغ تھے۔ مثلاً غالبؔ، سر سیدؔ، محمد حسین آزادؔ، شبلی نعمانی، رتن ناتھ سرشار، عبدالحلیم شرر، ڈپٹی نذیر احمد، الطاف حسین حالی، راشد الخیری، ابوالکلام، بابائے اُردو، حسرت موہانی، ظفر علی خاں، برجموہن وتاتریہ، حسن نظامی اور سیّد سلیمان ندوی ان کے رشحاتِ قلم اب بھی زُبان کے گنج شائگاں ہیں۔ ان کی نگارشات کے بالاستعیاب مطالعہ سے ہم اُردو میں دستگاہ حاصل کر سکتے ہیں۔ ان سے اگلے دور میں غلام رسول مہر، قاضی عبدالغفار، عبدالمجید سالک، چراغ حسن حسرت، نیاز فتح پوری، پروفیسر رشید احمد صدیقی، آلِ احمد سرور وغیر ہم زُبان اُردو کے شناور تھے۔ اُردو نے ان سے بہت کچھ حاصل کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں نے زُبان سے محبت پیدا کی۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی، عمر کی آخری منزل تک پہنچ چکے ہیں۔ لیکن ان کے قلم سے جو کچھ نکلتا ہے اس میں اب بھی دلہن کی حیا اور دولہا کا شباب ہوتا ہے۔

محسوس ہوتا ہے کہ ہم ذہنی طور پر ایک ادبی عظمت اور فکری سطوت کے ہمرکاب ہیں۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی کی ہر تحریر پر فردوس کی روشوں کا گمان ہوتا ہے۔ اُن سے زُبان تنوع حاصل کرتی اور دماغ فکر و نظر کے جادوں پر ٹہلنے لگتا ہے۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے زُبان و بیان اور علم و نظر کی ریاستیں قائم کی ہیں۔ انہیں پڑھ کر معلوم ہوتا ہے اُردو، عربی کے بعد فی الواقعہ اسلام کی دوسری بڑی زُبان ہے۔ ابوالاعلیٰ کے مطالعہ سے ہم سیکڑوں موضوع حاصل کر سکتے ہیں۔ یہی اُردو شعرا کا معاملہ ہے۔ 1857ء سے لے کر 1975ء تک ان کی ایک ڈار لگی ہوئی ہے۔ مثلاً میر تقی میر، مومن، انیس، دبیر، سودا، غالب، ذوق، حالی، داغ، اکبر الٰہ آبادی، اقبال، ظفر علی، حسرت موہانی، اصغر، جگر، سیماب، فانی، حفیظ، فراق، دانش، اختر شیرانی اور فیض، ان سب سے ہم خطابت کا سرو سامان اور اظہار و اسلوب کی ادائیں حاصل کر سکتے ہیں۔ ان سب ادبا و شعرا کے مطالعہ سے ایک ایسے خطیب کی منزلت اور ایک ایسے مقرر کی سطوت حاصل ہو سکتی ہے، جو عوام کے دماغوں کو فتح کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اُن کے دلوں کو ہاتھ میں لے سکتا ہے۔ اُردو کسی لحاظ سے تشنہ زُبان نہیں۔ خلا یہ ہے کہ نئی پود زُبان سے تہی داماں ہو چکی ہے۔ اس کے پڑھنے، سوچنے اور بولنے کی زُبانیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

(41) کسی مقرر کے طرز (سٹائل) کی نقل نہ کرو اور یہ کوشش کرو کہ وہ نقل آپ کی اصل ہو جائے، اصل اصل ہے۔ کاربن کاپی بننے سے کچھ فائدہ نہیں۔ دوسروں کے محاسن سے فائدہ ضرور اٹھاؤ۔ ان کے اظہار و اسلوب، اور بیان و زُبان سے اپنی انفرادیت کے لیے اخذ کرو۔ ایک نامور مقرر کی تکنیک کا مطالعہ خود ایک تکنیک پیدا کرتا ہے۔ لیکن اس کا چربہ اُتارنا، فنی علو کے لیے، مفید نہیں۔ ناقل بہرحال ناقل ہی رہتے ہیں اور اُن کا شعلہ بعجلت کجلا جاتا ہے۔

کئی لوگوں نے ابوالکلام، محمد علی، عطاء اللہ شاہ بخاری کی نقل کرنا چاہی لیکن کہیں نہ کہیں ان کا شعلۂ گفتار ماند پڑ گیا۔ ابوالکلام، ابوالکلام ہی رہا اور محمد علی، محمد علی ہی رہے۔ ایک دوسرے کی جگہ نہ لے سکے۔ دونوں اپنے فن میں کامل تھے۔ مثلاً جوش و جگرؔ، دونوں عصری شاعر تھے۔ لیکن نہ جگرؔ جوش کی جگہ لے سکے اور نہ جوشؔ، جگر کو پہنچ سکے۔ احسان دانشؔ، اختر شیرانی نہ ہو سکے اور اختر شیرانیؔ، احسانؔ دانش نہ بن سکے۔ کمال دونوں کے پاس رہا۔ بہ قول سعدیؔ..... ع

ہر گلے را رنگ ــــ و بوئے دیگر ست

42) چرب زُبانی سے دامن بچاؤ۔ طلاقتِ لسانی پیدا کرو۔ ان خطبا کی ہو بہو نقل محال ہے جو خطابت کی رعنائی کے ساتھ، علم کی گہرائی رکھتے تھے، اور قدرت نے انہیں ملکۂ وہبی دے رکھا تھا۔ چہروں کا حُسن اور آنکھوں کی مستی کے متعلق معلوم ہے کہ وہ کیا ہے؟ لیکن ہر چہرے اور ہر آنکھ میں حُسن و مستی کی چھاپ مختلف ہوتی ہے اور یہی چشم و عارض کی انفرادیت ہے۔ فی الجملہ حُسن و مستی دلربائی کا خزینہ ہیں۔ تمام کائنات ان سے بھرپور ہے لیکن حُسن و مستی کسی کتاب یا اخبار کی طرح نہیں کہ ہر روز کا اخبار یکساں ہو گا اور کتاب کا ہر نسخہ ایک سا ہو گا۔ ہر چہرے کے ساتھ حُسن و مستی منفرد ہوتی ہے۔ اسی طرح زُبان و بیان کی بُو قلمونی کا نام خطابت ہے۔

تمام انسان ایک ہیں۔ ان کا سانچہ یکساں ہے۔ لیکن اربوں انسانوں میں سے ایک شکل دوسرے سے نہیں ملتی۔ اس سے مشابہ خطابت کی انفرادیت ہے۔ اگر خطابت کا چہرہ مُہرہ واحد ہو تو اس کی مثال درخت کے پتوں کی ہے۔

43) ہر فضا کے ساتھ خطابت کا ایک لہجہ اور ایک اظہار ہوتا ہے۔ وہ راگوں کی طرح نہیں کہ جس راگ کو چھیڑا جائے اس کے حدود کا احترام کیا جائے ورنہ راگنی یا راگ منہدم ہو جائے گا۔ خطابت مالکونس نہیں کہ اس کی دُھنیں اور سُریں ملحوظ

رکھی جائیں۔ خطابت ایک ہی ذھن میں کئی ذھنوں کا مجموعہ اور ایک ہی عُمر میں کئی عُمروں کا مرقع ہے۔ بالفاظِ دیگر آواز کی مختلف تصویروں کا البم ہے۔ ہر تصویر کی فضا دوسرے سے علیحدہ ہے۔ ابوالکلامؒ کی آواز میں تمکنت تھی۔ عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی آواز میں تنوّع تھا۔ ظفر علی خاں تلوار کا لہجہ رکھتے تھے اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نسیم صبح کی طرح دھیمے ہیں۔ آپ محض آواز کے بل پر ان میں سے کسی کی نقل کرنا چاہیں تو مضحک ہو کر رہ جائیں گے۔ ابوالکلامؒ کی تمکنت میں ان کا علمی تبحر تھا، عطاء اللہ شاہ کے تنوّع میں خطابت کا وہبی ملکہ تھا۔ ظفر علی خاں ادب و شعر میں یکہ تاز تھے۔ ابوالاعلیٰ مودودی کا دھیما پن اُن کے دماغ کی صلابت کا ترشح ہے۔ وہ اس اعتماد سے بولتے ہیں گویا پڑھ رہے ہیں۔ جس طرح کسی شاعر یا ادیب کی جگہ لینا مشکل ہے۔ غالبؔ، غالبؔ تھے اور اقبالؔ، اقبالؔ، اسی طرح کسی خطیب کی جگہ لینا ممکن نہیں۔ ابوالکلامؒ، عطاء اللہ شاہؒ، ظفر علی خاںؒ اور ابوالاعلیٰ سے ہم بہت کچھ حاصل کر سکتے ہیں لیکن ان کی جگہ نہیں لے سکتے۔ کیونکہ ہر شمشیر بکف سکندرِ اعظم نہیں اور نہ ہر صحرانورد کو مجنوں کہہ سکتے ہیں۔

44) کوئی ایک طرزِ خطابت کے لیے پائیدار نہیں کیونکہ خطابت خیالوں کا میوزیم ہے جو آواز کی نیو پر قائم ہے۔ انسان مجموعہ ہے حواسِ خمسہ اور عناصرِ اربعہ کا۔ اس کا سر ہے، آنکھیں ہیں، ناک ہے، رخسار ہیں، منہ ہے، دانت ہیں، ٹھوڑی ہے، کان ہے، سینہ ہے، ہاتھ ہیں، کلیجہ ہے، ٹانگیں ہیں، جگر ہے، پاؤں ہیں، دل ہے، انگلیاں ہیں۔ جس طرح سلاست خطابت کی رُوحِ رواں ہے، اس طرح انسان کی زندگی خون کی گردش پر قائم ہے۔ کسی ایک عضو کو خواہ وہ کتنا ہی اہم ہو، ہم انسان نہیں کہہ سکتے۔ اسی طرح ہم کسی ایک طرز کو خطابت نہیں گردان سکتے۔ کئی طرزوں کی رنگا رنگی سے خطابت کی تصویر ابھرتی ہے۔

45) جس طرح چرب زُبانی خطابت کے منافی ہے۔ اسی طرح لاف زنی خطابت کے

حُسن کو ضائع کرتی ہے اور نہ تذبذب کا لہجہ راس آتا ہے۔ بعض لوگ ایک طرز پکا لیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایک ہی پکوان کام و دہن کی لذت کو قائم نہیں رکھ سکتا۔ بعض لوگ ریاضی کی طرح خشک اور منطق کی طرح پیچ دار ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ استدلال کے ہو جاتے، کچھ گتکا بازی کرتے، کئی واعظوں کی طرح گلے بازی فرماتے، اکثر جذباتی انداز کا سہارا لیتے اور کئی غضب ناک لہجہ یا خشمگیں آواز میں گتھے رہتے ہیں۔ ان میں بعض اجزا خطابت کی شریانوں میں شمار کیے جاسکتے ہیں اور موضوع و مضمون کے مقام و محل کی رعایت سے ان کی ضرورت خود بخود پیدا ہو جاتی یا پیدا کی جاتی ہے لیکن خطابت کسی خاص طرز یا کسی واحد ادا کا نام نہیں۔ خطابت، ایک وجدان کی مختلف البحر، غزلوں کے مختلف المعنی جذبات واحساسات کا مجموعہ ہے۔

46) سامعین کو اس طرح خطاب کرو، گویا وہ آپ کی طاقت ہیں اور آپ اُن سے متمتع ہونا چاہتے ہیں۔ مجمع سادہ ذہن او سادہ دل ہو کر آتا ہے۔ یہ نہ سمجھو کہ وہ کچھ نہیں۔ وہ سب کچھ ہے لیکن اسے کیا دے سکتے ہیں۔ سماعت کی پذیرائی کا فریضہ ہے۔ عوام کے دل مضراب ہیں، آپ انہیں چھیڑ کر نغمہ پیدا کریں، خطابت یہی ہے۔

47) ایک مقرر کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ عوام کی نفسیات کیا ہیں؟ وہی مقرر کامیاب ہو سکتا ہے جو عوام کی نفسیات جانتا اور انسانی طبائع کی بو قلمونیوں سے واقف ہے۔ ہر وہ انسان جو مجمع میں شریک ہے، آپ سے کچھ حاصل کرنے آیا ہے۔ ہر شخص کچھ چاہتا ہے، اُس کی ضرورت ہے، وہ محسوس کرتا ہے، اُس کی پسند و ناپسند ہے۔ بعض چیزوں سے محبت کرتا، بعض سے نفرت کرتا ہے۔ اُس کے کچھ خوف ہیں۔ کچھ جرأتیں ہیں۔ اُس کی عادت مستمرہ تقلید ہے۔ وہ باہمد گر مختلف ہیں۔ وہ سوچتا ہے۔ اُس کے کچھ اعتقادات و معتقدات ہیں۔ وہ

تغیرات کا دلدادہ ہے۔ وہ ردّ و قبول کا جوہر رکھتا ہے۔ وہ سیادت و قیادت کا احترام کرتا ہے۔ اُس کے کچھ تصورات ہیں۔ اُس کا میلان و رجحان ہے۔ اس کا شعور و لاشعور ہے۔ ہر انسان کا مطالعہ بحیثیت انسان، ایک خطیب کا لازمہ ہے۔ آپ مخصوص اشارات اور بدیہی اسلوب ہی سے عوام پر قابو پا سکتے ہیں۔ لیکن کوئی چیز مصنوعی نہ ہو۔ ملحوظ رکھیے کہ آپ بہت سی چیزیں سامعین و حاضرین کے حافظہ کی لوح پر اُجال رہے ہیں اور بہت سی چیزیں اُن کے دل سے کُرید کر انہیں یہ احساس دلا رہے ہیں کہ آپ انہی کی سرگزشت بیان کر رہے ہیں۔ وہ محسوس کرتے لیکن کہہ نہیں سکتے تھے۔ آپ نے ان کے خوابیدہ احساسات کو جگا کر متحرک کرنا ہے۔ کمالِ خطابت یہی ہے کہ آپ انہیں چشم زدن میں پہاڑوں پر لے جاتے، زمینوں میں دھنس دیتے اور سمندروں میں گھمانے لگتے ہیں۔

48) ہمیشہ دوست کی حیثیت سے خطاب کرو اور عوام کو یہ تاثر کبھی نہ دو کہ آپ اُن سے الگ انسان ہیں یا اُن کے ہدایت کار ہیں۔ آپ اُن کے لیے معلّم نہیں، اُن کے ہمسفر ہیں۔ وہ خود محسوس کریں کہ آپ اُن کے میر کارواں ہیں۔

49) اپنے معترض کو نفرت سے نہیں، محبت سے جواب دیں۔ اور وہ جواب مسکت و مدلل ہو لیکن اعتراض کی نوعیت کے پیشِ نظر جواب کی شیرینی و تلخی ضرور ہو۔ بسا اوقات کچھ لوگ خرابی و خلل پیدا کرنے کے لیے اعتراض کرتے ہیں۔ اُن پر حاضر کلامی و برجستہ گوئی سے ترکش سے نشتر چھوڑنا، سرجن کے آپریشن کی طرح کام کرتا ہے۔ کسی شریر الطبع معترض کے سامنے سپر انداز نہ ہوں بلکہ اُس خوش طبعی کے ساتھ اُسے چت کریں کہ وہ خود محسوس کرے کہ پٹخنی کھا گیا ہے۔

50) انشا و شعر میں تکرار عیب ہے، لیکن تقریر و خطابت میں تکرار عیب نہیں۔ بشرطیکہ آپ کسی نظریے یا مقصد کو عوام کے ذہنوں میں وحدتِ مقصد کی

غرض سے اتارنا چاہتے ہیں اور آپ نے اس غرض سے الفاظ کے مختلف پیرہن پہنائے ہیں۔

51) جب مجمع بہت بڑا ہو تو آپ استدلال سے کہیں بڑھ کر جذبہ سے کام لیں اور اپنے ذہن میں یہ بات نقش رکھیں کہ عوام جذبات کی مخلوق ہیں۔ وہ استدلال کے نہیں جذبہ کے شیدائی ہوتے ہیں۔ دنیا کو اس قدر اصولوں نے الٹ پلٹ نہیں کیا جتنا شخصیتوں نے ہلایا ہے۔ جب کسی تحریک کا زمانہ ہو تو عوام توے پر اسپند کی طرح ہوتے ہیں۔ وہ دماغ کے بجائے دل کی مخلوق ہوتے اور استدلال کی بہ نسبت جذبہ کی پکڑ میں رہتے ہیں لیکن دلوں سے کھیلئے نہیں دلوں کو اُجالیے کہ خطابت میں دلوں سے کلام کیا جاتا ہے۔

52) خطابت کو خارجی علم نہ سمجھیں، وہ آپ کا وہبی ملکہ ہے۔ اور باقی دوسرے اجزا آپ کی تقریر کے رنگ یا خطوط ہیں آپ کا مُوِ قلم تخلیق کرتا ہے۔ آپ کا علم سکہ کی طرح ہے۔ اس کا انحصار آپ پر ہے کہ آپ اسے کہاں اور کیونکر صَرف کرتے ہیں۔

53) اب خطابت وہ نہیں رہی جو کبھی تھی۔ ایک زمانہ میں وعظ تھے اور ان کی خاص ادائیں تھیں۔ اب ان کا مزاج یکسر بدل چکا ہے۔ ان کا انداز کچھ اس طرح ہو گیا ہے کہ آپ عوام کی عدالت میں اپنا مقدمہ کیونکر پیش کر سکتے اور کس طرح ان کے خیالات کو آواز دے سکتے ہیں۔

54) صاحبِ طرز خطیب دماغوں کو پرستش کے بجائے پرسش کی طرف لے جاتا اور دلوں کو اسی طرح ہاتھ میں لیتا ہے گویا وہ اس آرزو میں تھے۔ امیر خسرو کے الفاظ میں ع

ہمہ آہوانِ صحرا سرِ خود نہادہ بر کف

بہ امید آں کہ روزے بشکار خواہی آمد

مختصر یہ کہ خطابت ابر پاروں کا جھالا ہے جس سے کھیت جوان ہوتے، لالہ زار کھلکھلانے لگتے اور صرصر کی لہریں اڑنچھو ہو کر فضا کے سفینہ کو صبا کے لیے خالی کر دیتی ہیں۔ فی الجملہ خطابت زبان و بیان کا معجزہ ہے کہ اس سے دلوں کی سنگینی موم کی طرح پگھلنے لگتی ہے۔

55) علماو فضلا اور شعرا و ادبا پر نگاہ رکھیے کہ وہ کس لفظ کا استعمال کس طرح کرتے ہیں۔ ہر لفظ ہر جگہ کے لیے نہیں اور نہ الفاظ کے اسراف و تبذیر کا نام طلاقتِ لسانی ہے۔

56) صبح کی ہوا صحت کے لیے اور صبح کا اخبار خطابت کے لیے لازم ہے۔ آج کا انسان اخباری مطالعہ کے بغیر گھپ اندھیروں میں کھو جاتا ہے۔ ہر انسان علاقائی حدود کی شہریت کے باوجود ذہنی اعتبار سے عالمی ہو چکا ہے۔

57) مقرر کے لیے سب سے بڑی نعمت اُس کا حافظہ ہے۔ حافظہ کا تعلق صحت کے ساتھ ہے۔ حافظہ کو مستحکم کرنے کے لیے ہر وہ چیز استعمال کیجیے جس سے اس کو جِلا ملتی ہے۔

58) کبھی اس قسم کے صنائع و بدائع یا استعارے اور تشبیہیں استعمال نہ کیجیے جو عوام کی ذہنی استعداد کے لیے پہیلی ہوں۔ ان استعاروں اور تشبیہوں سے کام لیں جو عوام کے دماغ کا حلق سے نکلتے ہی اعادہ کر لیں۔ اور وہ لطف محسوس کریں کہ آپ انہیں ساتھ لے کر چل رہے ہیں۔

59) مولانا ابوالکلام آزادؔ کے نزدیک تقریر کی معراج یہ تھی کہ لوگ ہونٹوں کی جنبش کا انتظار کریں کہ آپ اُن کے لیے کیا لائے ہیں۔ سیّد عطاء اللہ شاہ بخاریؒ فرماتے: مَیں جانتا ہوں مجھے لوگوں سے کیا کہنا ہے اور لوگ کیوں جمع ہوئے ہیں لیکن مَیں ہمیشہ اُن کے چہرے کی شکنوں اور نگاہوں کے ڈوروں سے اپنے موضوع کا انتخاب کرتا ہوں۔ مولانا ظفر علی خاں کا خطابت کے متعلق نقطۂ نگاہ

تھا کہ عوام سامنے ہوں تو مضامین غیب سے پیدا ہوتے اور عوام تحسین کرتے ہیں، تو نطق، زباں کے بوسے لینے لگتا ہے۔

60) ہمیشہ یہ چیز سامنے رکھیے کہ جلسۂ عام میں آپ خواص سے نہیں، عوام سے مخاطب ہیں۔ آپ کی اصل طاقت عوام ہیں۔ ان کی اکثریت کو خواص کی اقلیت پر قربان کرنے سے آپ نہ تو اپنا نقش جما سکتے اور نہ حصولِ مقصد میں کامیاب ہو سکتے ہیں کیوں کہ عوام و خواص کے ذہنی میدان مختلف ہیں۔

61) بسا اوقات اپنے سے برتر خطیب اور بلند تر شخصیت کا غیر شعوری دبدبہ آپ کو لاشعوری طور پر اس طرح مرعوب کرتا ہے کہ آپ احساسِ کمتری کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ ایک طبعی امر ہے۔ ہر مقرر کو اس حالت سے گزرنا پڑتا ہے۔ لیکن اس پر قابو پانا مشکل بھی ہے اور آسان بھی! اگر آپ کے پاس اپنے موضوع کا سرمایہ ہے اور آپ خطابت کے اُور چھور سے واقف ہیں تو آپ خود اعتمادی سے اس حالت پر قابو پا سکتے ہیں اور اس کے خوف کو گرد کی طرح جھاڑ سکتے ہیں۔ جب تقریب و اجتماع اس انداز کا ہو تو اپنے موضوع کی ہمہ جہت تیاری کے بعد خطابت کریں۔ آپ کے ابتدائیہ پر عوام کی تحسین آپ کے ذہن کو جگمگا دے گی اور آپ کا ذہنی راستہ کھل جائے گا۔

62) خطابت کی شاخیں بہت سی ہیں۔ مثلاً سیاسی، علمی، سماجی، پارلیمانی، عدالتی۔ پھر علمی خطابت میں مذاکرات و مباحثات ہیں۔ دینی خطابت میں مساجد کے خطبے ہیں، وعظ ہیں۔ میلاد خوانی ہے۔ مناظرہ ہے۔ ذاکری ہے۔ سماجی خطابت میں ضیافتی، تعزیتی، تہنیتی، وداعی اور مدح و تشکر کی تقاریر ہیں۔ لیکن خطابت فی زمانہ فرد و ریاست کے سیکڑوں مسائل اور سیکڑوں مراحل سے متعلق اجتماعی مکالمت کا نام ہے۔

زبان و بیان

آواز و بیان خطابت کی اساس ہیں۔ جس طرح رُوح کے اُڑ جانے سے آدمی مر جاتا ہے اور خون کے منجمد ہونے سے انسان مر جاتا ہے۔ اسی طرح آواز کے بغیر خطابت نہیں اور زبان کے بغیر اظہار نہیں۔ ان کے بغیر خطابت کی ہر چیز شل ہے۔ پچھلے صفحات میں آواز و زبان کے متعلق کئی ایک اشارات ہیں۔ فی زمانہ کئی ایک خطبا زبان کے خلا کا شکار ہیں اور دینی خطابت کے سوا، دوسرے دوائر میں یہ خلا کچھ زیادہ محسوس ہوتا ہے۔ ہمارے سیاسی راہنما خصوصیت سے اس کا شکار ہیں کہ وہ ذہانت اور علم و فراست کی بلندیوں پر پہنچ کر بھی زبان و بیان کے خلا میں ہیں۔ اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ اُردو سے متعلق ان کا مطالعہ مختصر و محدود ہے۔ انہوں نے زبان کو بحیثیت زبان کبھی حاصل نہیں کیا اور بلکہ اس کے مبادیات سے بھی ناواقف ہیں۔ انہوں نے اُردو کو معاشرتی طور پر حاصل کیا اور اس کے بل پر عوام سے خطاب کرتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کی زبان کمزور ہوتی۔ تلفظ میں ٹھوکر کھا جاتے، الفاظ کے زیر و بم سے نابلد ہوتے اور انگریزی الفاظ کے پیوند لگا کر گزارہ کرتے ہیں۔ ان میں روانی ہو تو وہ سلاست نہیں ہوتی۔ اس میں ایک ٹھہراؤ ہوتا ہے اور وہ اپنے نام کی وجہ سے سُنے جاتے ہیں۔ ان کی خطابت علامتوں، سکتوں اور وقفوں سے چلتی ہے اور وہ تحریر کے انداز میں تقریر کرتے ہیں۔ اس وقت انگریزی عالمی زبان ہو چکی ہے اور تمام دنیا اس کے پھیلاؤ میں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ دوسری کوئی زبان اس کی ہمہ گیری کا مقابلہ نہیں کر سکتی اور بہت سی زبانوں کا گزارہ اس کے تراجم پر ہے۔ بلاشبہ انگریزی سے الگ رہ کر ہم

عالمی معلومات سے بہرہ مند نہیں ہو سکتے اور نہ تاریخ و سیاست کی ہمہ گیری حاصل کر سکتے ہیں لیکن ہمارے قائدین یا سیاسین جنہیں انگریزی پر ناز ہے وہ اپنی زبان سے محرومی کے خلا کا احساس نہیں کرتے اور شاید اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ اُردو سے سیاسی فضا میں علاقائی زبانوں کی معرفت انتقام لیتے ہیں۔

اُردو نے انگریزی عہد میں ایک تاریخ پیدا کی۔ اس سے قطع نظر کہ مسلمانوں نے اُردو کی معرفت اپنی بڑی بڑی شخصیتوں کو جنم دیا اور سر سید سے لے کر اقبال تک اُردو ہی ذریعہ خطاب رہی۔ اُردو ہی کے بل پر مسلمانوں نے اپنے ملی تشخص کو قائم کیا لیکن متحدہ جدّوجہد کی مشترکہ چھاپ کو بھی اُردو نے مجلّی کیا۔ مثلاً ادب و شعر کے میدانوں میں اُردو کو تمام ہندوستانی زبانوں میں فوقیت رہی۔ مسلمانوں کے ساتھ ہندو بھی شریک تھے۔ اگر پہلے دور میں رتن ناتھ سرشار، چکبست سہائے سرور اور برجموہن دتاتریہ وغیرہم ادب کے نامور انسان تھے تو آخری دور میں ایک بڑی کھیپ پیدا ہو چکی تھی۔ اس میں منشی پریم چند، کرشن چندر، فراق گورکھپوری، کنہیالال کپور، گوپال متل، راجندر سنگھ بیدی، جمناداس اختر اور چونی لال کاوش وغیرہم افسانہ، ناول اور شعر میں برسر آوردہ تھے۔ کچھ یہی انداز صحافت کا تھا۔ مہاشہ کرشن، نانک چند ناز، گوپی ناتھ امن، شری رنبیر، دیوان سنگھ مفتون اس میدان میں یکہ تاز تھے۔ پنڈت مدن موہن مالویہ ہندو سبھا کے لیڈر رہے تھے لیکن ان کی زبان میں ہمیشہ اُردو کا لوچ شباب پر رہا۔ پنڈت جواہر لعل نہرو، ان کے پتا پنڈت موتی لعل نہرو اور بابو راجندر پرشاد اُردو اس طرح بولتے گویا شاخوں پر کلیاں چٹخ رہی ہیں۔ سر تیج بہادر سپرو انجمن ترقی اُردو کے صدر رہے۔ انہیں اُردو سے عشق تھا۔ وہ اس شیریں کے فرہاد تھے۔ جب یہ لوگ ہندو مسلم اختلافات کی طغیانیوں میں بھی اُردو کی معرفت عوام کے ذہنوں کی فتح مندیاں حاصل کرتے رہے اور ان کی خطابت میں کوئی پیوند نہیں ہوتا تھا، تو سیاسین کی نئی پود کا اُردو سے محروم ہونا قومی سانحہ ہے۔

اُردو دوسری زبانوں سے مختلف نہیں۔ وہ جدید زبانوں میں سب سے کم عمر ہے۔ انگریزی اور عربی کے بعد اس کی فتوحات عظیم ہیں۔ اگر سیاست کی تلخیاں مانع نہ ہوتیں تو اس کو مختلف طرز کے علاقائی صدمے نہ پہنچتے اور اس کا برِ عظیم میں پھیل جانا یقینی تھا لیکن اس کے صدمات لسانی نہیں، سیاسی ہیں۔ یاد رہے زبان کسی کی ایجاد نہیں ہوتی اور نہ اسے کوئی ایجاد کرتا ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی بادشاہت کا آخری دور تھا اور مغلوں کا رختِ سفر بندھ رہا تھا تو اُردو کی ولادت ہوئی۔ انگریزی نے فارسی کو نکال باہر کیا۔ اس کی جگہ اُردو کو دی اور انہی کے عہد میں بالا ہوئی۔ علامہ برجو ہن دتاتریہ کی تحقیق کے مطابق اُردو پنجاب میں پیدا ہوئی۔ اس کا پہلا شاعر امیر خسرو اور پہلے ناشر حضرت گیسو دراز تھے۔ اُردو کی پہلی غزل ایک ہندو شاعر نے لکھی۔ اُس کا تخلص برہمن تھا۔ مولوی عبدالحق کے الفاظ میں اُردو ہندی نژاد ہے اور قدیم ہندی یا پراکرت کی آخری اور سب سے شائستہ صورت ہے۔ اس کے تمام حروف، فاعل، مفعول، اضافت، نسبت، ربط وغیرہ ہندی ہیں۔ ضمیریں سب کی سب ہندی ہیں۔ افعال ہندی ہیں البتہ عربی، فارسی اور قدرے انگریزی زبانوں کا اثر اسما صفات پر ہے جس سے اس کی دلآویزی قائم ہوئی اور طاقت بڑھی ہے۔

پچھلے صفحات میں زبان سے متعلق بعض مصنفین کا ذکر آچکا ہے کہ ان کے مطالعہ سے ہم خطابت کے بعض خصائص حاصل کر سکتے ہیں۔ جن لوگوں کو انگریزی آتی ہے، وہ معلومات کے اعتبار سے تشنہ نہیں رہ گئے۔ ہم مذہب و ادب اور تاریخ و سیر کے اسلامی و قومی ذخائر تو اپنی زبان ہی سے حاصل کر سکتے ہیں یا پھر عربی زبان اور پہلوی زبان ہمارے علم و نظر کا سرمایہ ہو سکتی ہے لیکن جدید علوم جن کی بدولت بیسیوں شاخیں ہیں اور ان کی بدولت ایک عالمی معاشرہ پیدا ہُوا ہے۔ اس کا ہمہ گیر لٹریچر انگریزی زبان میں ہے اور وہی عالمی ادب کا مستند سرمایہ ہے۔ بہر حال اُردو خطابت میں کمال حاصل کرنے کے لیے زبان کا بحیثیت زبان حصول و مطالعہ ضروری ہے۔ جب

تک زبان کی وسعتوں اور ضابطوں سے آگاہ نہ ہوں، ہم اپنی زبان میں وہ قدرت پیدا نہیں کر سکتے جس سے زبان میں سلاست کا اعجاز پیدا ہوتا ہے۔ مقصود یہ نہیں کہ آپ لغوی ہو جائیں لیکن لغت سے محروم ہونا خوبی نہیں۔ قواعدِ زبان سے آشنائی ایک طاقت ہے۔ آپ صرفی و نحوی نہ ہوں لیکن صرف و نحو سے غفلت نہ برتیں۔ زبان اس طرح سیکھی جاتی ہے کہ آپ کی محفلیں شائستہ ہوں۔ آپ کے احباب ادبی ہوں۔ آپ ٹیلی ویژن اور ریڈیو سے مستند ادیبوں، ثقہ شاعروں اور جید عالموں کے نشریے سنیں آپ ان کتابوں پہ نگاہ رکھیں جو زبان سکھاتی ہیں اور ایسی کتابیں کچھ زیادہ نہیں جن سے زبان کے آداب معلوم ہو سکتے ہیں۔

بعض ادیب و خطیب حروف ربط کے استعمال میں ٹھوکر کھاتے ہیں۔ کئی ایک زبان کے سلسلہ میں معمولی آداب سے بھٹک جاتے ہیں۔ مثلاً ہمارے ہاں پنجاب میں، نے، کا غلط استعمال رواج پا چکا ہے۔ اکثر خطیب اور کئی ادیب اس کے عادی ہو چکے ہیں۔ مَیں نے کراچی جانا ہے یا مَیں نے کھانا کھانا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ غلط ہے۔ صحیح فقرہ ہے، مجھے کراچی جانا ہے یا مجھے کھانا کھانا ہے۔ اسی طرح حسبِ ذیل فقرے ہیں:

غلط فقرے	صحیح زبان یہ ہے کہ:
1) یہ میں نے دیکھا ہوا ہے۔	1) یہ مرا دیکھا ہوا ہے۔
2) یہ تقریر میں نے سنی ہوئی ہے۔	2) یہ تقریر مری سنی ہوئی ہے۔
3) یہ کتابیں میں نے پڑھی ہوئی ہیں۔	3) یہ کتابیں مری پڑھی ہوئی ہیں۔

(قواعد اردو)

بعض کتابیں آپ کے علم میں اضافہ کرتی ہیں۔ بعض غور و فکر کی عادت ڈالتی ہیں۔ بعض زبان کی توانائی میں اضافہ کرتی ہیں۔ بعض اسلوب پیدا کرتی ہیں۔ بعض انظہار سکھاتی ہیں۔ بعض سلاست کی راہ بتاتی ہیں۔ بعض مطائبات میں اتارو کرتی ہیں۔ بعض الفاظ کی نوک پلک سے آگاہ کرتی ہیں لیکن کچھ کتابیں ایسی بھی ہیں جو زبان کی

معرفت پیدا کرتی ہیں۔ مثلاً بابائے اُردو کے قلم سے قواعدِ اُردو بہترین کتاب ہے۔ اسی طرح علامہ برجموہن دتاتریہ کے قلم سے کیفیہ ایک ایسی تالیف ہے جو زُبان سے ادائیں سکھانے میں مخلص دوست کی طرح ہے۔ مثلاً جانوروں کے بچوں کو ہم بچہ ہی کہتے ہیں، سانپ کا بچہ، اُلّو کا بچہ، بلّی کا بچہ لیکن اُردو میں ان کے لیے جدا جدا الفاظ ہیں جیسے:

بکری کا بچہ	......	میمنا
بھیڑ کا بچہ	......	برہ
ہاتھی کا بچہ		پاٹھا
اُلّو کا بچہ		پٹھا
بلّی کا بچہ		بلونگڑہ
گھوڑی کا بچہ		بچھیرہ
بھینس کا بچہ		کٹڑا
مرغی کا بچہ		چوزا
ہرن کا بچہ		برنوٹا
سانپ کا بچہ		سنپولا
سوّر کا بچہ		گھٹیا

اسی طرح بعض جانداروں اور غیر جانداروں کی بھیڑ کے لیے خاص الفاظ مقرر ہیں۔ جو اسم جمع کی حیثیت رکھتے ہیں مثلاً طلبہ کی جماعت، رندوں کا حلقہ، بھیڑوں کا گلہ، بکریوں کا ریوڑ، گووں کا چونا، مکھیوں کا جھلڑ، تاروں کا جھرمٹ یا جھومر، آدمیوں کی بھیڑ، جہازوں کا بیڑا، ہاتھوں کی ڈار، کبوتروں کی ٹکڑی، بانسوں کا جنگل، درختوں کا جھنڈ، اناروں کا کنج، بدمعاشوں کی ٹولی، سواروں کا دستہ، انگور کا گچھا، ٹڈی دل، کیلوں کی گہل، ریشم کا لچھا، مزدوروں کا جتھہ، فوج کا پرا، روٹیوں کی تھئی، لکڑیوں کا گٹھا، کاغذوں کی گڈی، خطوں کا طومار، بالوں کا گچھا، پانوں کی ڈھولی، کلابتو کی کنجی.....

اُردو کی عظمت کا اندازہ اس سے کیجیے کہ ہر جانور کی صوت کے لیے علیحدہ لفظ ہے۔ مثلاً شیر دھاڑتا ہے، ہاتھی چنگھاڑتا ہے، گھوڑا ہنہناتا ہے، گدھا ہینچوں ہینچوں کرتا ہے، کتا بھونکتا ہے، بلی میاؤں کرتی ہے، گائے رانبھتی ہے۔ سانڈ ڈکارتا ہے، بکری ممیاتی ہے، کوئل کوکتی ہے، چڑیا چوں چوں کرتی ہے، کوا کائیں کائیں کرتا ہے، کبوتر غٹر غوں کرتا ہے، مکھی بھنبھناتی ہے، مرغی کڑکڑاتی ہے، اُلو ہوکتا ہے، مور چنگھاڑتا ہے، طوطا رٹ لگاتا ہے، مرغا ککڑوں کوں کرتا ہے، پرندے چرچراتے ہیں، اونٹ بغبغاتا ہے، سانپ پھنکارتا ہے، گلہری چٹ چٹاتی ہے، مینڈک ٹراتا ہے، جھینگر جھنگارتا ہے، بندر گھگھیاتا ہے۔

کئی چیزوں کی آوازوں کے لیے مختلف الفاظ ہیں۔ مثلاً

بادل کی گرج، بجلی کی کڑک، ہوا کی سنسناہٹ، توپ کی دنادن، صراحی کی گٹ گٹ، گھوڑے کی ٹاپ، روپوں کی کھنک، ریل کی گھڑ گھڑ، گویوں کی تا تا ری ری، طبلے کی تھاپ، طنبورے کی آس، گیند کی گونج، گھڑیال کی ٹن ٹن، چھکڑے کی چوں اور چکی کی گھر......

ان اشیا کی خصوصیت کے لیے ان الفاظ پر غور کیجیے۔ موتی کی آب، کُندن کی دمک، ہیرے کی ڈلک، چاندنی کی چمک، گھنگھرو کی چھن چھن، دھوپ کا تڑاقا، بُو کی بھبک، عطر کی لپٹ، پھول کی مہک۔

مسکن کے متعلق مختلف الفاظ ہیں جیسے بارات کا محل، بیگموں کا حرم، رانیوں کا انواس، پولیس کی بارک، رشی کا آشرم، صوفی کا حجرہ، فقیر کا تکیہ یا کٹیا، بھلے مانس کا گھر، غریب کا جھونپڑا، بھڑوں کا چھتا، لومڑی کا بھٹ، پرندوں کا گھونسلا، چوہے کا بل، سانپ کی بانبی، فوج کی چھاؤنی، مویشی کا کھڑک، گھوڑے کا تھان (بقیہ)۔

اس طرز کے متعدد خصائص سے اُردو زبان مالا مال ہے۔ اس کا دامن تمثیلوں اور کہاوتوں سے بھرا پڑا ہے۔ اس پر محاوروں کی رنگا رنگی مستزاد ہے۔ ان کی بہت سی

قسمیں ہیں مثلاً حیوانی محاورے، اعضائی محاورے، نباتاتی محاورے، خود نوشتی محاورے، پوشاکی محاورے، موسمی محاورے، آبی محاورے، عددی محاورے، رزمی محاورے، نفسیاتی محاورے، خدمتی محاورے، اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اُردو کی وسعتیں کیا ہیں اور بطور زُبان اس میں کس قدر تنوع ہے۔ جو زُبان اپنے گردو پیش کے احوال وظروف کا تعین و توضیح کر سکتی ہے، وہ زُبان ہر ضرورت پر قادر ہو سکتی ہے۔ الفاظ پیدا نہیں ہوتے، الفاظ بنائے جاتے ہیں۔ ہر ایجاد، ہر اختراع اور ہر ضرورت انہیں ڈھالتی ہے۔ سوال ہے کہ آپ کا شوق کہاں تک ساتھ دیتا ہے۔ اس زمانہ میں مولانا ابو الاعلیٰ مودودی، مولانا ابو الحسن ندوی، پروفیسر رشید احمد صدیقی اور ڈاکٹر سید عبد اللہ کو پڑھ کر آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ اُردو کسی موضوع یا کسی مضمون میں زُبان کے اعتبار سے اُدھوری ہے یا مربوط نہیں۔ وہ زمانہ لد گیا جب ہمارے ادیب و خطیب زُبان کے دبدبے سے مرعوب کرتے تھے اور ان کے متعلق یہ خیال کیا جاتا تھا کہ وہ سامع و قاری کو کچھ دینے کے بجائے اُس پر اپنے بیان یا اپنی انشا کی ہیبت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اب اُردو میں وہ سب کچھ کہا جا سکتا ہے جو آپ کہنا چاہتے ہیں یا موضوع آپ سے کہلوانا چاہتا ہے۔ اگر آپ زُبان نہیں جانتے تو آپ کچھ کہہ نہیں سکتے اور اگر آپ زُبان جانتے ہیں تو آپ سبھی کچھ کہہ سکتے ہیں۔ وہ چیز جس کا نام اسلوب یا اظہار ہے وہ علم کی نسبت سے زُبان کی معرفت پیدا ہوتی ہے۔ زُبان لکھیے کہ زُبان کی مثال شیشہ و جام کی ہے۔ جس میں آپ علم کا مشروب پیش کر سکتے ہیں۔ خطابت کسی کے لیے شہد اور کسی کے لیے صہبا ہے۔ ظاہر ہے کہ شہد و شراب اوک کی چیزیں ہیں۔

زُبان سیکھنے کے ضمن میں، مَیں نے اپنے اس شعار کو ہمیشہ قائم رکھا کہ عظیم المرتبت خطیبوں کے لب و لہجہ پر نگاہ رکھی۔ مَیں نے اکثر تقریریں صرف اس لیے سنیں کہ زُبان کیا ہے؟ اور صحیح خطیب صحیح زُبان کیونکر بولتے ہیں؟ وہ اشہبِ بیان پر کیونکر سواری کرتے اور اسلوب کی وادیاں کیوں کر قطع کرتے ہیں۔ مَیں نے کئی برس

تک مولانا ظفر علی خاں کی معیت کا شرف حاصل کیا اور مدة العمر سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری کے ساتھ رہا، حقیقت یہ ہے کہ مَیں نے ان بزرگوں سے تلفظ پایا۔ الفاظ و مطالب کا رشتہ معلوم کیا اور آواز کے اتار چڑھاؤ سیکھے۔ کسی طرح ان کی نقل نہ کر سکا کہ دونوں ناپید اکنار تھے اور اُن کے صدف میں خاص قسم کے موتی تھے۔ ان کی نقل کرنا آسان نہ تھا۔ مولانا ظفر علی خاں علی گڑھ سے فارغ التحصیل ہو کر حیدر آباد دکن کے شرفا میں رہے۔ انہوں نے سر سیّد، وقار الملک، محسن الملک، علامہ شبلی، مولانا حالی اور مرزا داغ دہلوی کی صحبتوں کا فیض حاصل کیا تھا۔ ان کے لہجہ کی لٹک اور کھنک پیدا کرنا سہل نہ تھا۔ سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ بنارس میں رہے۔ نانی اماں سے لہجہ پایا۔ شاد عظیم آبادی سے استفادہ کیا اور یہ اُن کی زُبان سے آشنائی کا دور تھا۔ اس کے بعد اقلیم خطابت کے شہنشاہ ہو گئے۔ جس کسی نے ان کی ریس کرنا چاہی، ان کا عشر عشیر نہ ہو سکا لیکن وہ اپنے ساتھیوں کو بہت کچھ سکھا گئے۔ مَیں نے ظفر علی خاں سے زُبان کا بانکپن سیکھا اور شاہ جیؒ سے خطابت کا جوبن حاصل کیا۔ ان کی بدولت اُردو کی محبّت سے رگ و ریشہ معمور ہو گیا۔

آواز خطابت کی جان ہے۔ آواز نہیں تو کچھ نہیں۔ خطابت کا فن آواز سے ہے۔ ایک خطیب یا مقرر کے لیے آواز کے زیر و بم سے آشنا ہونا ضروری ہے۔ آواز کا اتار چڑھاؤ خطابت کا لازمہ ہے۔ پچھلے صفحوں میں اجزائے خطابت کے تحت آواز سے متعلق عرض کیا جا چکا ہے اور آواز کی تربیت پر اشارات آ چکے ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ مقرر یا خطیب جب مجمع سے خطاب کرتے ہیں تو ان کی آواز یکساں رفتار پر نہیں ہوتی اور نہ اُن کا لہجہ ہم وزن ہوتا ہے۔ اس کے لیے اک بحر نہیں، کئی بحروں کا مجموعہ ہے۔ کہیں مقرر گفتگو کا لہجہ اختیار کرتا ہے، کہیں نرم لہجہ، کہیں زوردار اور کہیں ان کا حد اوسط..... مقرر اپنے الفاظ کا حُسن زیر و بم سے بڑھاتا ہے۔ اس کو اظہار کے اتار چڑھاؤ سے گزرنا پڑتا ہے۔ ایکا ایکی گونج پیدا کرتا اور یکایک گرج سے کام

لیتا ہے۔ کبھی اس کی آواز میں بوندا باندی ہوتی اور کبھی وہ موسلا دھار انداز میں برسنے لگتا ہے۔ کبھی صبا کی طرح چلتا اور کبھی صرصر ہو جاتا ہے۔ آبشار کی طرح بہتا ہے، اس میں چشمہ کا بہاؤ اور جھرنا کا غل بھی ہوتا ہے۔ وہ راگ نہیں جانتا لیکن اس کی آواز کبھی دیپک راگ ہو جاتی ہے اور کبھی جلترنگ، وہ آواز میں آنسو پیدا کرتا اور قہقہہ اُچھالتا ہے۔ وہ چشم زدن میں ہنسا اور رُلا سکتا ہے۔ وہ رعد کی طرح کڑکتا اور شعلے کی طرح بھڑکتا ہے۔ اس میں غنچہ کی چٹک اور نغمہ کی لٹک ہوتی ہے۔ وہ بادل کی کڑک اور ہیرے کی ڈلک رکھتا ہے۔

کوئل کی طرح کوکتا اور شیر کی طرح دھاڑتا ہے۔ خطیب کی آواز سمندر کی لہروں کی طرح ہے کہ اپنی سطح سے اٹھکیلیاں کرتی چلی جاتی ہیں۔ یہ درست ہے کہ اِکا دُکا مقرر خوش آواز ہوتے ہیں لیکن بہر حال وہ موسیقار نہیں ہوتے لیکن اُن میں آواز کی رعنائی قوس قزح کے رنگوں کی طرح ہوتی ہے اور وہ جانتے ہیں کہ آواز خطابت میں کس قدر سے بڑھتی اور گھٹتی ہے۔ اس کی حرارت کے درجے کیا ہیں۔ ان فقروں پر غور کیجیے۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ کی تقاریر سے حافظہ کی معرفت نقل کیے ہیں:

1) عزیزو! اس وقت رات تا بہ کمر آپہنچی ہے۔ ہم جدوجہد کے جس میدان میں ہیں۔ اس نے آپ کے دلوں کی انگیٹھی کو سلگا رکھا ہے۔ آپ کے ولولے مائل بہ پرواز اور حوصلے مصائب سے بے نیاز ہیں۔ اب اندھیری رات ٹھہر نہیں سکتی کہ ستاروں کے خون ہی سے صبح کا اجالا ہوتا ہے۔

2) اس آلۂ جہیر الصوت (لاؤڈ سپیکر) کے ذریعہ مری آواز اس مجمع کا احاطہ کر سکتی ہے۔ اس کے چاروں کونوں میں پھیل سکتی ہے۔ مشرق کی پیشانی کو بوسہ دے سکتی ہے۔ مغرب سے ہم آغوش ہو سکتی ہے۔ شمال تک پرواز کر سکتی ہے اور جنوب تک پہنچ سکتی ہے۔ حتیٰ کہ ثریا کی بلندیوں پہ اڑ سکتی ہے اور ثریٰ کی تہوں میں اتر سکتی ہے۔ لیکن بتا سکتے ہو تمہارے دل و دماغ کے درمیان کتنا فاصلہ ہے

تا کہ اپنی آواز وہاں تک پہنچا سکوں۔

3) عزیزو! سیاست ایک آگ ہے جو پہلے خود بھڑکتی ہے پھر بھڑکائی جاتی ہے اور دل جب تک آشنائے لذتِ درد نہ ہو، برف کی ایک قاش ہے جو پانی تو بن سکتی ہے لیکن آگ میں نہیں جلا کرتی۔ اب جو قدم اٹھ چکے ہیں انھیں بیاباں نہیں روک سکتے کہ ہم نے تلوے سہلا لیے ہیں اور خارِ مغیلاں کی مدارات کے لیے آبلے حاضر ہیں۔ اب سمندروں کی موجوں میں ہمارے لیے کوئی خوف نہیں۔ ہم ان سے کھیل سکتے ہیں۔ پہاڑوں کی چوٹیاں ہمارے عزم کے سامنے خاک کا تودہ ہیں جب قوم سربکف ہو کر آزادی کے سفر کو نکلتی ہے تو اس کے لیے موانعات کے انبار پرکاہ ہو کر رہ جاتے ہیں اور نصب العین کی سچائی منزل تک پہنچ کر رہتی ہے۔

4) ہم نے وقت کی تبدیلیوں کو پہچان لیا ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہفتوں میں صدیاں گزرتی چلی جارہی ہیں۔ اب زمانہ وہ نہیں رہا جو کبھی تھا۔ اس کی چال بہت بہتر ہو چکی ہے۔ پردے گرتے اور پردے اٹھتے ہیں۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ آئندہ لمحہ کیا ہونے والا ہے۔ اپنے بارے میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے دماغ نے اقتضائے بشریت کے تحت کسی فیصلہ میں کوئی غلطی کی ہو لیکن ہمارے دل نے اپنے ارادوں میں کوئی سی کوتاہی نہیں کی۔ ہم نے آبرو سے جینے اور آبرو سے مرنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ ہم نے موت سے آنکھیں چار کرنے کا عزم کیا ہے۔ یہ تو ممکن ہے کہ ہم سانپوں کی بانبوں میں چلے جائیں اور ان سے آشنائی پیدا کر لیں، بھڑوں کے چھتے سے مصافحہ کر لیں، شیروں کے غار میں رہنے لگیں۔ بچھوؤں سے رسم پیدا کریں اور چیتوں سے معانقہ کریں لیکن اب یہ ممکن نہیں رہا اور ہم نے دوٹوک فیصلہ کر لیا ہے کہ انگریزوں کی غلامی کے ساتھ نہیں رہ سکتے۔ ہم اپنا ہاتھ برطانوی استعمار سے تعاون کے لیے نہیں بڑھا سکتے۔ ایسے ہاتھ کا جسم سے کٹ جانا ہی بہتر ہے۔

5) افسوس ہے کہ ہم نے اپنی تاریخ سے آنکھیں موندھ لی ہیں۔ ہم نے اپنے ماضی کی عظمتوں کو فراموش کر دیا ہے۔ ہمارے نزدیک فقدانِ ہمت کا نام تقدیر ہے اور تذبذب کا نام تدبیر! ہم بھول چکے ہیں کہ تاریخ کی صبح طلوع نہیں ہوئی تھی تو ہمارا قافلہ گنگا و جمنا کے ان میدانوں میں وارد ہوا تھا۔ اور ہم نے ان کے کناروں پر اُس وقت فجر کی اذانیں دی تھیں جب اس کے سرسبز میدانوں کو انتشار کی سیاہیوں نے گھیر رکھا تھا۔ کبھی ہم نے کائنات کی تقدیر کو پلٹ ڈالا تھا اور ہم بازار ہستی کے مالک تھے۔ اب ہم خود ایک جنس ہیں اور اس انتظار میں ہیں کہ وہ کون ہے جو ہماری بولی دے گا۔ قلعہ معلیٰ کی سُرخی پیازی ہو چکی ہے اور شاہی مسجد کے مینار جھک کر سوال کرتے ہیں کہ تم ہی ان لوگوں کے وارث ہو جنہوں نے ہمیں اِستادہ کیا تھا۔ ہم نے اپنی ہمتِ کشور کشا کھو دی ہے تو کہاں؟ اور یہ کیا ہے کہ تاریخ کے لیے عبرت کا ورق ہوتے جا رہے ہیں۔ کیا اپنے گمشدہ اقبال کے مزار کا سنگی کتبہ ہو کر رہنا چاہتے ہو؟

مندرجہ بالا پانچوں ٹکڑوں پر غائر نظر ڈالیے۔ آپ محسوس کریں گے کہ ان میں آواز کے بہت سے نشیب و فراز ہیں۔ ان کا پڑھنا ایک چیز ہے۔ ان کا بولنا دوسری چیز ہے مثلاً ایک ہی فقرے میں کئی لہجے ہیں۔ پہلے حوالے میں عزیزو! اس وقت رات تابہ کمر آپہنچی ہے کے تین لہجے ہیں۔ ایک عزیز کا لہجہ ہے، دوسرا رات آپہنچی ہے کا لہجہ ہے اور تیسرا تابہ کمر کا لہجہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اس فقرے میں تابہ کمر دوسرے تمام لہجوں سے بلند لہجہ ہے۔ پہلے اقتباس کے جلی حروف میں آواز کی تمکنت ہو گی۔ اور باقی فقرے لہجہ کے اتار چڑھاؤ سے بیان ہوں گے۔

دوسرے اقتباس میں آکہ جہیر الصوت کی گونج کے ساتھ اس کا صوتی آہنگ ہو گا جو ایک مغنی کی دھنوں میں ہوتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ یہ گیت نہیں۔ نہ اس کی ادائی، ترنم چاہتی ہے۔ اس کے لیے ایک اس کی ضرورت ہے جو ہر خطیب کے علو اظہار میں

ہوتا ہے۔

تیسرا اقتباس نثر میں ایک نظم ہے۔ اور اس کے لیے آواز مضراب کے تاروں کی طرح گھٹتی اور بڑھتی ہے۔ جس طرح ایک شاعر تحت اللفظ پڑھتا اور مصرعوں کی معنویت کے ساتھ لہجہ کے سوز میں تموّج پیدا کرتا ہے۔ بالکل اسی طرح ان الفاظ کا آہنگ ہے۔ ایک مصوّر کے رنگوں کی طرح کچھ الفاظ شوخ ہیں، کچھ مدھم ہیں۔ کچھ رسیلے، کچھ جوشیلے اور کچھ نکیلے ہیں۔ ہم اشارات کے ساتھ انہیں متشکل کرتے ہیں۔ آواز ان الفاظ میں جان بھرتی ہے اور لہجہ کے مدّ و جزر پر اظہار کی رنگینی ہے۔

چوتھے اقتباس کے نصف اول میں چشمۂ صافی کی دل آویزی یا شہنائی کا نغمہ ہے۔ الفاظ کی نشست پر غور کریں اور خطابت کی پیوستگی دیکھیں کہ دونوں اس طرح ہم آغوش ہیں جس طرح شبِ وصل میں دو محبتیں بوس و کنار کرتی ہیں۔ کسی فقرے میں خلا نہیں۔ جس طرح ایک کارواں بہت سے آدمیوں سے مرتب ہوتا اور دماغوں کی رنگا رنگی کے باوجود اس میں ایک ذہنی وحدت ہوتی ہے۔ اسی طرح اقتباس کے حصّہ اول میں ربط و ترتیب ہے۔ اس کے ہر جملہ سے ایک تقریر پیدا ہوتی اور اس پر کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ اسی جامعیت کا نام خطابت ہے۔

دوسرا حصّہ (نصف ثانی) میں جدّوجہد کی پکار، اُبلی تلواروں کی دھار ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہم فلک شگاف نعروں کی شاہراہ سے گزر رہے ہیں۔ اور نعرہ ہائے رستاخیز نے ہمیں گھیر رکھا ہے۔ ان کے گھیراؤ سے ہم میں ایک ولولہ، ایک حوصلہ، ایک پیغام اور ایک اقدام کا جلال و جمال پیدا ہو گیا ہے۔

آخری حصّہ میں گونج اور گرج کی لہروں میں جوار بھاٹا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے میدانِ جنگ میں خیمے گاڑ رکھے ہیں اور سپاہ کسی لحظہ رجز پڑھ کر کشتوں کے پشتے لگانے کے لیے تیار ہے۔ ان فقروں کا مزاج پاٹ دار ہے اور ان میں صُورِ اسرافیل کی تب و تاب ہے۔ اس کے ہر لفظ کے ساتھ ایک حرکت، ہر معنی کے ساتھ ایک اشارہ

اور ہر بولی کے ساتھ ایک دعوت ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ خطابت کا سحر، بیان کا ایجاز اور اظہار کا اعجاز انگڑائی لے رہا ہے۔

پانچویں اقتباس میں درد کی لہریں ہیں یا پھر عبرت کی صدائیں اور اندوہ کا شیون ہے۔ اس اقتباس میں گریۂ ابرِ بہار اور درخندۂ تیغ اصیل کے علاوہ، تاریخ کی پکار اور سفر کا سنگِ میل ہے۔ اس میں کوئی نغمہ نہیں، نوحہ ضرور ہے۔ ایک آواز ہے جو فریاد کے سانچہ میں ڈھل کے بلند ہوئی ہے۔ ایک نصیحت ہے جو پہاڑی کا وعظ نہیں، ایک ترغیب ہے جو طور سینا ہو کر کربلا تک پہنچتی ہے۔ اس کی آواز پرواز کرتی ہے۔ اس کے لہجہ میں اڑان ہے۔ اس نکرہ ہی سے آواز کے دروبست، نشیب و فراز، مدوجزر اور جلال و جمال کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہم کس لفظ سے کیا سلوک کریں۔ کہاں گرمی پیدا کریں اور کہاں نرمی سے گزر جائیں۔

آواز و زبان کے اس آب و گِل ہی سے ہم خطابت کا ہیولیٰ تیار کر سکتے ہیں۔ اس کا اعادہ شاید غلط نہ ہو کہ خطابت تغیرِ زبان کے جوہر کا پانی ہے۔ اور زبان بغیر آواز کے خشک چٹان ہے۔ مطالعہ کبھی ترک نہ کیجیے کہ مطالعہ سے انسان کا ذہن نشوونما پاتا اور اس کی فکر کو جلا دیتا ہے۔ مطالعہ کے بغیر انسان ریگ زار کی طرح ہے۔ اس میں مشاہدہ کی لَو ہے تو سراب کی طرح ہے۔ مطالعہ ہی سے انسان کی ذہنی گمراہیاں ختم ہوتی ہیں اور مطالعہ وہ طاقت ہے جس سے انسان کو تہذیب کی توانائی ملتی ہے۔ اگر مطالعہ نہ ہوتا تو انسان وحات اور پتھر کی زندگی بسر کرتا، وہ محسوس ہی نہ کر سکتا کہ وہ کیا ہے۔ اور اس کی دماغی سرگذشت کیا ہے؟

انسان نے مطالعہ ہی کی بدولت ایک دوسرے سے آگاہی حاصل کی ہے اور مطالعہ ہی کے فیوض ہیں کہ ہم مطالعہ کی بدولت یہاں تک پہنچے ہیں کہ ہم نے مابعد الطبیعیاتی پر کمندیں ڈالیں اور انسان و کائنات کے وجوہ معلوم کیے ہیں۔ خطابت، انسان سے اجتماعی کلام کی اولین صورت ہے۔ باقی سب کچھ اس کے بعد پیدا ہوا۔ تب وہ زمانہ

تھا کہ انسان کا سب سے بڑا خزانہ حافظہ تھا اور حافظہ ہی کے بل پر وہ خطابت کا شہریار تھا۔ لیکن قرطاس و قلم پیدا ہوئے اور تالیفات و تصنیفات کا سلسلہ چلا تو دنیا یکسر بدل گئی۔ اب کوئی چیز وطنی و قومی نہیں رہی۔ بعض لوگ محصور رہنا چاہیں تو ان کا مزاج ہے۔ کچھ لوگ ماضی میں زندگی بسر کرنے کے عادی ہوتے ہیں، لیکن علم کے سوتے عالم گیر ہو چکے ہیں۔ اب ہر چیز عالمی ہے۔ پہلے مقرر و خطیب وطنی و قومی فضا کے حزبی یا مذہبی ترجمان تھے۔ اب مقرر و خطیب عالمی و کائناتی آواز ہیں۔ کسی بھی دنیاوی حصّہ میں کوئی سانحہ یا واقعہ ہو، اس پر ہر ملک میں احتجاج ہو سکتا اور اس پر خطابت کی محفل جم سکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے انسان کا درد مشترک ہو چکا اور اُس کے اضطراب کا موضوع واحد ہے۔

خطابت کی اساس آواز پر اور آواز کی طاقت زُبان سے ہے لیکن خطابت کا ہیولیٰ مطالعہ سے تشکیل پاتا اور مطالعہ میں مشاہدہ و تجربہ سے تناسب پیدا ہوتا ہے۔ مطالعہ کے لیے کوئی خاتمہ نہیں۔ اس میں تسلسل ہے۔ جس طرح صبح و شام طلوع و غروب ہوتے اور روز و شب ازل سے ابد کی طرح رواں ہیں، اسی طرح ہمیشہ سے مطالعہ ہمیشہ کے لیے ہے۔ ہر زمانہ میں اس کی نوعیتیں بدل جاتی ہیں لیکن اس کا سفر ختم نہیں ہوتا۔ اس کے لالہ زار میں استیعاب کے ساتھ شگوفے کھلتے اور پھول بنتے ہیں۔

اخبار و جرائد کا مطالعہ تاریخ و سیاست کے سفر کو جاری رکھتا ہے۔ ان دونوں موضوعات پر کتابوں کے ڈھیر ہیں۔ چونکہ دنیا ہر لحظہ بدلتی اور انقلاب بہر عنوان آتے چلے جاتے ہیں۔ اس لیے تاریخ و سیاست کی جزئیات تک محفوظ کی جاتی ہیں۔ کیا چیز ہے جو حوالۂ قلم نہیں ہو چکی ہے۔ مذہبیات، ادبیات، نفسیات، معاشیات، سیاسیات، عمرانیات، طبیعیات، شخصیات وغیرہ کا ہر گوشہ تحریر میں آ چکا ہے۔ ان سب کو عمومی ضرورت کے مطابق مطالعہ میں رکھیے کہ ان سب جواہر پاروں کے صدف کا نام خطابت ہے۔

